ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومنٹیز

MUD-010

Special Study of Meer Taqi Meer and Mirza Ghalib

میر تقی میر اور مرزا غالب کا خصوصی مطالعہ

جلد دوم

بلاک 4

مرزا غالب: حیات و شخصیت 5

بلاک 5

مرزا غالب: فکر و فن (اول) 85

بلاک 6

مرزا غالب: فکر و فن (دوم) 173

EXPERT COMMITTEE

Professor Malati Mathur
Director, School of Humanities
IGNOU, New Delhi.

Professor Mohammad Faruq Ansari
DEL, NCERT, New Delhi.

Professor Mohd. Shahid Husain
Shahjahanabad Apartments
Sector -11, Dwarka, New Delhi

Professor S.M. Anwar Alam
New Delhi. Centre of Indian Languages, JNU,

COURSE COORDINATOR

Dr. Shakir Ali, Assistant Professor, School of Humanities, IGNOU, New Delhi

Editor: Prof. Wahajuddin Alvi, Former Dean, Faculty of Humanities and Languages & Professor, Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi

COURSE PREPARATION

Writers	Units
Prof. Nasera Basri, Head, Department of Urdu and Persian, Rajasthan University, Jaipur, Rajasthan	17
Dr. Irfan Ahmad Malik, Associate Professor, Department of Urdu, Central University of Kashmir, Kashmir, J&K	18, 19 & 22
Dr. Uzair Ahmad, Assistant Professor, Department of Urdu, Islampur College, Uttar Dinajpur, West Bengal	20
Dr. Mohd. Mukeem, Assistant Professor, Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi, Delhi	21
Dr. Musheer Ahmad, Assistant Professor, Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi, Delhi	23 & 24
Dr. Noor Fatima, Assistant Professor, Department of Urdu, MANUU, Lucknow Campus, Lucknow, UP	25
Prof. Shamshul Hoda, Head, Department of Urdu, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad, Telangana	26
Dr. Mohd. Akbar, Assistant Professor, CPDUMT, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad, Telangana	27
Dr. Zubair Ahmad Siddiqui, Assistant Professor (Urdu), Distance and Online Education, Aligarh Muslim University, Aligarh, UP	28 & 29
Dr. Shakir Ali Siddiqui, Assistant Professor, Discipline of Urdu, IGNOU, New Delhi, Delhi	30
Dr. Sajid Zaki Fahmi, Assistant Professor, Department of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi, Delhi	31
Prof. Mohd. Moazzamuddin, Department of Education in Language, NCERT, New Delhi, Delhi	32

PRODUCTION

Mr. Tilak Raj
Assistant Registrar (Pub.)
MPDD, IGNOU, New Delhi

April, 2023
© Indira Gandhi National Open University, 2023
ISBN:
All rights reserved. No part of this work may be reproduced in any form, by mimeograph or any other means, without permission in writing from the copyright holder.
Further information on the Indira Gandhi National Open University courses may be obtained from the University's office at Maidan Garhi, New Delhi-110068 or the official website of IGNOU at www.ignou.ac.in
Printed and published on behalf of the Indira Gandhi National Open University by Registrar, MPDD, Maidan Garhi, New Delhi
CRC Prepared by Tessa Media & Computers, C-206, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, N.D.-25
Printed at:

کورس کا تعارف

بلاک 4 مرزا غالب: حیات وشخصیت 5

اکائی 17 عہد غالب کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال 7
اکائی 18 عہد غالب کا شعری منظر نامہ 17
اکائی 19 غالب کے سوانحی کوائف 35
اکائی 20 غالب اور پنشن کا قضیہ 53
اکائی 21 غالب کے ادبی معرکے 69
اکائی 22 غالب کے اہم معاصرین 87

بلاک 5 مرزا غالب: فکر وفن (اول) 101

اکائی 23 غالب کی خطوط نگاری کا تنقیدی جائزہ 103
اکائی 24 غالب کے پانچ منتخبہ خطوط کی تدریس وتفہیم 117
اکائی 25 غالب کی اردو اور فارسی نثری تصانیف کا تعارف 135
اکائی 26 جدید اردو نثر اور غالب کا اسلوب نگارش 155

بلاک 6 مرزا غالب: فکر وفن (دوم) 171

اکائی 27 غالب کی قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ 173
اکائی 28 غالب کے منتخبہ قصیدے کی تدریس وتفہیم 187
اکائی 29 غالب کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ 223
اکائی 30 غالب: ردیف "الف" کی منتخب غزلوں کی تدریس وتفہیم 239
اکائی 31 غالب: ردیف "ن" کی منتخب غزلوں کی تدریس وتفہیم 259
اکائی 32 غالب: ردیف "ی" کی منتخب غزلوں کی تدریس وتفہیم 281

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

MUD-010

Special Study of Meer Taqi Meer and Mirza Ghalib

میر تقی میر اور مرزا غالب کا خصوصی مطالعہ

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومنٹیز

بلاک

4

مرزا غالب: حیات و شخصیت

بلاک 4 کا تعارف

اکائی 17
عہد غالب کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال 7

اکائی 18
عہد غالب کا شعری منظر نامہ 17

اکائی 19
غالب کے سوانحی کوائف 35

اکائی 20
غالب اور پنشن کا قضیہ 53

اکائی 21
غالب کے ادبی معرکے 69

اکائی 22
غالب کے اہم معاصرین 87

بلاک 4 تعارف

بلاک 4

اکائی:17 عہدِ غالبؔ کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورتِ حال

ساخت

17.1 اغراض و مقاصد
17.2 تمہید
17.3 عہدِ غالب کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورتِ حال
  17.3.1 عہد غالب کی سیاسی صورت حال
  17.3.2 عہد غالب کی سماجی صورتِ حال
  17.3.3 عہد غالب کی تہذیبی صورتِ حال
  17.3.4 ماحصل
17.4 آپ نے کیا سیکھا؟
17.5 اپنا امتحان آپ خود لیجیے
17.6 سوالوں کے جوابات
17.7 فرہنگ
17.8 کتب برائے مطالعہ

17.1 اغراض و مقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- عہد غالب کی سیاسی صورت حال سے واقف ہوں گے۔
- عہد غالب کی سماجی صورت حال سے متعارف ہوں گے۔
- عہد غالب کی تہذیبی صورت حال سے روشناس ہوں گے۔
- عہد غالب کی اہمیت، افادیت اور معنویت نیز اس کے ادبی منظرنامے سے باخبر ہوں گے۔
- عہد غالب کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی اثرات غالب کی شاعری پر کس قدر مرتب ہوئے، سے آگاہ ہوں گے۔

17.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائیوں میں آپ نے میر تقی میرؔ کا مختلف جہتوں سے خصوصی مطالعہ کیا۔ اب آپ اپنے کورس کے دوسرے حصے میں مرزا غالب کا مختلف حوالوں سے خصوصی مطالعہ کریں گے۔ اس مطالعہ میں سب سے پہلے آپ عہد غالب کو جانیں گے تاکہ بہ خوبی علم ہو سکے کہ آیا غالب کے عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال کیا تھی۔ تخلیق کار کی تخلیقات پر مخصوص عہد کے اثرات شعوری اور غیر شعوری دونوں طور سے مرتب ہوتے ہیں۔ لہٰذا عہد غالب کو سمجھے بغیر غالب کے متن کو سمجھنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ غالبؔ دنیائے اردو کے ہی نہیں بلکہ دنیا کی دیگر زبانوں کے عظیم شاعروں میں سے ایک ہیں۔ وہ ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ بلند پایہ نثار بھی ہیں، ان کے کلام اور خطوط خود ہی ان کے عہد کی تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی صورتِ حال کو جاننے میں معاون ہیں۔ لہٰذا اس سبق میں آپ عہد غالب کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

17.3 عہدِ غالب کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورتِ حال

17.3.1 عہد غالب کی سیاسی صورت حال

غالبؔ کے سیاسی حالات کو مطلق طور پر مثبت یا منفی زاویے کے مطابق سمجھا جا سکتا ہے۔ غالب کی ولادت کے وقت مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو رہا تھا اور اس سلطنت کے زوال کا باعث حکمرانوں کی عیش پرستی تھا، یہی وجہ ہے جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو عیش پرستی کا دور تھا، مسلمان دین سے غافل ہو کر تن پرستی میں مبتلا تھے اور روایت کو دین سمجھتے تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کی حکومت جا چکی تھی مگر اس کی بو دماغوں میں بسی تھی، انگریز مسلمانوں کو سیاسی، معاشی، اور دماغی طور پر اپنا غلام بنا رہے تھے، انگریزوں نے ملک کے معاشی حالت بد سے بدتر کر دیے تھے، انگریزوں کی حکمتِ عملی تھی کہ مسلمانوں کو معاشی اعتبار سے کمزور کر دیا جائے تاکہ ملک مسلمانوں سے چھینا جا سکے، یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں فاتح قوم کا نزلہ مسلمانوں پر ہی گرا۔

جب غالبؔ ۷ سال کی عمر میں آگرہ سے دہلی آئے تو یہاں اکبر شاہ ثانی کا دور حکومت تھا، دہلی میں ہی ان کی تعلیم و تربیت ہوئی اور ان کا ذوق سخن پروان چڑھا، لیکن جب غالبؔ کا تخلیقی دور شروع ہوا تو وہ زمانہ دبستان دہلی کی شعری اور ادبی سرگرمیوں کا آخری دور تھا، مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے دربار میں شعر و سخن کی محفلیں آراستہ ہوتی رہتی تھیں۔ غالبؔ بھی ان محفلوں میں شریک ہوتے، ذوقؔ کے بعد غالبؔ بادشاہِ وقت بہادر شاہ ظفر کے استاد بنے اور نجم الدولہ دبیر الملک کے خطاب اور خلعت سے نوازے گئے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں ہندوستان کی لائق ترین اور نامور ہستیاں وفات پا چکی تھیں، ۱۷۹۷ء میں اودھ کے نواب آصف الدولہ وفات پا چکے تھے، ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو شہید کر دیا تھا۔ ۱۷۶۴ء میں انگریزوں سے بکسر کی جنگ ہارنے کے بعد مغل بادشاہ شاہ عالم برائے نام بادشاہ رہے، دکن میں نظام ابتدا ہی سے انگروزوں کی

سرپرستی میں آ گیا تھا۔

دہلی کے عوام جان و مال کی حفاظت کے لیے دربدر بھٹکنے لگے تھے۔ زندگی وبالِ جان ہو چکی تھی، ایسے حالات میں بہت سے اصحاب شعروسخن ترکِ وطن پر مجبور تھے۔ عملی طور پر دہلی پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ مگر ہندوستان کی مقامی طاقتوں کی لوٹ مار نے دہلی کی زندگی وبالِ جان بنادی تھی۔ اسی دوران انگریز دہلی کے علاوہ دوسرے علاقوں میں اپنے ہاتھ پیر پھیلاتے رہے، بنگال پر قبضہ جمالیا، دکن کو ماتحت بنایا، انگریزی سرمایہ داروں نے ملک کو خوب لوٹا، انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی لڑی گئی، ۱۸۵۷ء میں جگہ جگہ بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے، لیکن انگریزوں نے ہندوستانیوں کو شکست دی، غدر میں کامیاب ہونے پر انگریزوں نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کو قتل کر دیا اور بہادر شاہ ظفر کو رنگون میں قید کر دیا اور وہیں پر ان کا انتقال ہوا۔ اس وقت سیاسی افراتفری اور قومی انتشار اپنے عروج پر تھا۔ اس وقت کے سیاسی حالات کو سمجھنے میں غالب کے خطوط بہت معاون ہیں، خاص طور پر ایام غدر اور اس کے بعد سے چشم دید حالات خطوط میں بیان ہوئے ہیں، مثلاً اس خط کو دیکھیے:

> ’’پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر پر ہوا، پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہل شہر کا اعتبار مٹا، دوسرا لشکر خاکیوں کا، اس میں جان و مال، ناموس، مکان و مکیں، زمین کا، اس میں ہزار آدمی بھوکے مرے زمین و آسمان سراسر لٹ گیا، تیسرا لشکر کا جو کال کا تھا، چوتھا لشکر ہیضے کا اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے،‘‘
>
> (بنام نواب الدولہ شفق)

غدر کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت اپنے ہاتھ لے لی اور جمہوریت کا آغاز ہو گیا، ایسے حالات میں غالبؔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ قدیم تہذیب دم توڑ رہی ہے اور جدید تہذیب اپنے قدم جمارہی ہے، غالبؔ اس قدیم اور جدید کے بیچ کا حصہ تھے ان کا دور وہ تھا جب اٹھارویں صدی ختم ہونے کو تھی اور انیسویں صدی کا آغاز ہو رہا تھا، یعنی انھیں نئے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ علاقائی زبانیں ابھرنے لگی تھیں۔ لوگ علاقائی زبانوں پر زور بھی دینے لگے تھے، اور ان سے اردو بھی متاثر ہوئی، اس وقت فارسی زبان ہی اہمیت کی حامل تھی، اس زبان کی بدولت سماج میں عزت اور سرکار و دربار میں اعلیٰ مراتب حاصل ہو سکتے تھے، لیکن فارسی کا مرکز ہندوستان میں ایک ترقی یافتہ طبقے کے بیچ میں تھا جو رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا اور اس کا زور کم ہو گیا اور اردو کی طرف لوگوں کی توجہ ہونے لگی تھی، غرض ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی دورِ حکومت میں تعلیم کو ضرور فروغ حاصل ہوا۔ جس نے قوم کی ترقی کی راہیں کھولیں اور اس کا آغاز مرزا غالب کی زندگی میں ہو چکا تھا، جو حقیقت میں اس دور کے تاریخی اور سیاسی حالات کا نتیجہ تھا، اس تعلیمی ترقی نے ہندوستان کے سماجی

حالات بھی متاثر کیے۔

فارسی کے اثرات انیسویں صدی سے کم ہوتے نظر آنے لگے تھے اور اردو کی سادگی سے سب متاثر ہو رہے تھے، میر امن، غالب، دہلی کالج اور سرسید احمد خاں سب کے یہاں اردو کی ترقی کے نقوش دیکھنے کو ملتے ہیں، فورٹ ولیم کالج نے اردو ادب میں صاف سادہ نثر کی شروعات کی، اور ادب کو آگے بڑھانے میں اپنی خدمات کو انجام دیا، ۱۸۰۳ء سے ۱۸۵۷ء کے بیچ کا دور اتھل پتھل کا دور تھا، ایک طرف مغل سلطنت کا زوال تھا تو دوسری طرف ایک نئی حکومت کا عروج، اس کے ساتھ علم وادب میں بھی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔

17.3.2 عہد غالب کی سماجی صورتِ حال

عہد غالب میں انگریزوں کے زیر اثر لوگوں کے رہن سہن، باہمی تعلقات، ایک دوسرے کی خوشی وغم، لباس پوشاک وغیرہ میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ غالبؔ نے اپنے خطوط میں اشارتاً سماجی زندگی کے بدلتے ہوئے رجحان پر روشنی ڈالی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ دہلی کے معاشی اور سیاسی حالات بگڑنے کی وجہ سے اس دور کی سماجی زندگی بھی بدل چکی تھی، ان کے زمانے میں دہلی کا لال قلعہ، جامع مسجد، اور چاندنی چوک دہلی والوں کی سماجی زندگی کے حصے تھے، جہاں لوگ ایک دوسرے سے ملتے، شاہی بازار اور دربار لگتے، پھول والوں کا میلا ہوتا وغیرہ۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> ’’جو پائے حال، دلی والو! سلام مسجد واگزاشت ہوگئی، چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنا ڈالیں، انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگے‘‘۔

غالبؔ کی اس تحریر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دہلی کی سماجی زندگی میں باہمی میل جول، بھائی چارہ اور آپسی تعلقات تھے، لوگ ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوتے تھے۔ دہلی میں ہر ہفتے جمنا کے پل پر لوگ سیر کو جاتے تھے، جامع مسجد کے گرد ہر ہفتے بازار لگتا تھا، پھول والوں کا ہر سال میلا ہوتا تھا، یہ سب باتیں دلی کی سماجی زندگی سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن یہ سب عوامل رفتہ رفتہ ختم ہوتے جا رہے تھے، ایسے ہی اور بھی کئی چھوٹے بڑے واقعات ہیں جن کی بنا پر ہم کو اس وقت کے سماجی حالات کے بارے میں پتہ چلتا ہے، قصیدے کہنا، محفلیں جمنا، مشاعرے ہونا، یہ سب اس وقت کے شوق ہوا کرتے تھے، لوگ اپنے گھروں میں کتب خانے بنوالیا کرتے تھے، لوگوں کے پاس کتابوں کے ذخیرے تھے، ان سب باتوں کی معلومات ہمیں خطوط غالب سے ملتی ہیں۔ غالبؔ نے اپنے خطوط میں دہلی کے موسموں کا بھی ذکر کیا ہے، سردی گرمی، اور برسات کی کیفیات بیان کی ہیں، جس کا اثر عام زندگی پر بھی پڑتا ہے، دہلی کے متعلق تو غالبؔ نے بہت کچھ لکھا ہے، اور اتنا لکھا کہ صرف ان کے خطوط کا مطالعہ کر کے دہلی کے حالات کے بارے میں سیاسی، سماجی، تاریخی اور معاشرتی حالت کا پتہ لگا سکتے ہیں مثلاً

بازار کی رونقیں، جامع مسجد، جمنا کا پل، پھول والوں کی گلی، بارش مکان، بلی ماروں کا محلّہ وغیرہ۔

اس وقت کے سماج میں مرغ بازی اور پتنگ بازی مسلمانوں کے محبوب مشغلے تھے۔ غالب کی ابتدائی زندگی جیسا کہ خود انہوں نے لکھا ہے، اس عیش پرستانہ ماحول کا آئینہ دار ہے۔ اس زمانے کے مسلمان اپنا وقت زیادہ تر کھیل تماشوں اور پھول والوں کی سیر میں صرف کرتے تھے اور رسموں میں گرفتار تھے۔ اس وقت کی زیادہ تر عوام جاہل پیروں اور شعبدہ بازوں، تعویز اور گنڈوں پر یقین رکھتی تھی۔ امرا اپنے بچوں کو علم حاصل کرنے کے لیے طوائفوں کے یہاں بھیجتے تھے۔ شاعری اور موسیقی کا بازار گرم تھا، ہر دولت مند آدمی کے یہاں مشاعرے ہوتے تھے، شعر وسخن دہلی کے سماجی زندگی کا ایک حصہ تھا، بزرگ شعرا داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے خوں ریز ہنگامے کے بعد بہت سے شعرا ترکِ وطن کر گئے تھے۔ لکھنؤ اور رامپور کے علاوہ بعض شعرا نے راجپوتانہ کی دہلی ریاستوں کا رُخ بھی کیا تھا۔ مطلب یہ کہ دہلی کا شعری اور ادبی شیرازہ بکھر گیا تھا، ترکِ وطن کی وجہ سے دہلی خالی ہوگئی۔ دلّی کے سماجی حالات بدتر تھے، سارا نظم ونسق انگریزوں کا تھا۔ وہ جو چاہتے وہ ہوتا تھا، راستہ بڑا کروانے، دوکانیں ڈھا دینے گویا ساری دلی میں توڑ پھوڑ کا کام چل رہا تھا، جس کی وضاحت مرزا غالب کے ایک خط سے ہوتی ہے:

> ’لو سنو اب تمہاری دلی کی باتیں ہیں، چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ وخشت وخاک ڈال کر بند کردیا تھا، بلی ماروں کے دروازے کے پاس کی کئی دوکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کرلیا گیا۔‘‘

اس طرح کے خطوط کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ مرزا غالبؔ کے خطوط اپنے عہد کے مختلف النوع واقعات کے عکاس ہیں، گویا ان کے خطوط سماجی صورت حال کا نہایت بیش قیمتی دستاویز ہیں جن سے غالبؔ کے عہد کی سماجی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔

17.3.3 عہدِ غالب کی تہذیبی صورتِ حال

کسی دور کے ادب کو اچھی طرح پرکھنے اور سمجھنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ اُس زمانے کی سماجی، معاشرتی، تاریخی اور سیاسی زندگی کا مطالعہ کیا جائے، فطرت انسانی ہمیشہ گردوپیش کے حالات سے متاثر ہوتی ہے، انسان کے افکار ونظریات، جذبات واحساسات، اخلاق وآداب، طریق معاشرت، میلان طبع اس کے ماحول سے بنتے اور خیالات پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ انقلاب، کشمکش، تغیر اور تبدیلی دنیا کا قانون ہے، ان تبدیلیوں کا اثر تہذیب وتمدن، ادب وآداب اور علوم وفنون پر بھی پڑنا لازمی ہے۔ قدیم زمانے میں سماج یا معاشرے میں عورت

اور غلاموں کی حالت بہت خستہ تھی۔ لوگ قبیلوں کی شکل میں رہتے تھے، قبیلوں میں جنگ ہوتی رہتی تھی، لیکن دھیرے دھیرے وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ تہذیب وتمدن، مذہبی عقائد، نظریات وخیالات بدلے، آہستہ آہستہ ریاست کا عمل شروع ہوا، ریاستوں اور حکومتوں کے قائم ہوتے ہی تہذیب کی ترقی ہوئی، ثقافت کی تعریف بنی، سماج میں معتبر اقدار قائم ہوئے، تہذیب وہ ہے جب کلچر میں زیادہ صفائی اور درستی آجاتی ہے تو وہ تہذیب بن جاتی ہے، کلچر اور تہذیب میں فنون لطیفہ بھی شامل ہوتا ہے، کلچر اور تہذیب کا ادب سے گہرا تعلق ہوتا ہے، سید عابد حسین نے تہذیب کو کچھ یوں متعارف کرایا ہے۔

> ”تہذیب نام ہے اقدار کے ہم آہنگ شمولیت کا جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے، جسے وہ اپنے اجتماعی ادارات میں ایک معروضی شکل دیتی ہے، جسے افراد اپنے جذبات رجحانات اور برتاؤ میں ان اثرات میں ظاہر کرتے ہیں، جو وہ ساری اشیاء پر ڈالتے ہیں“۔

انسانی معاشرے اور تہذیب کی شکل میں زبان وادب نہایت اہم رول ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ اگر انسان زبان وادب سے بے بہرہ رہتا ہے تو اس کی تہذیبی وتمدنی ترقی رک جاتی ہے، انسان کے تجربات، تہذیبی روایت، تاریخی واقعات، اقدارِ حیات اور طرز فکر ان سب کو زبان وادب کے ذریعہ محفوظ کرلیا جاتا ہے، اور ایک نسل کے تجربات دوسری نسل تک منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں، تہذیب وتمدن کی ترقی میں بنیادی اہمیت اس بات کی رہتی ہے کہ انسان میں فطرت کی قوتوں کو اپنی سہولیت اور مرضی کے مطابق ڈھال لے اور فطرت کی قوتوں کو تسخیر کرلے، مارکس نے اسی بات پر زور دیا کہ وجود خصوصا سماجی وجود انسانی شعور کو مطمئن کرتا ہے، اور معاشرتی تبدیلیاں انسانی تاریخ کی تشکیل کرتی ہیں، زبان وادب کی تاریخ بنیادی طور پر انسانی تہذیب کے آئینے میں ہی دکھائی دیتی ہے، تہذیب جن عناصر سے تشکیل پاتی ہے ان عقائد، جذبات، آداب، ادارے، تعلیم سب میں زبان وادب کی بہت بڑی اہمیت ہوتی ہے، تہذیبی روایت کسی تنہا شخص کی میراث نہیں ہوتی، یہ کسی خاص خطے اور خاص ملک تک محدود نہیں رہتی، ایک خاص عہد میں تمام دنیا میں ایک اجتماعی تہذیب کارفرما رہتی ہے، البتہ قدیم دور میں رسل ورسائل، آمدورفت کے ذرائع محدود تھے تب تہذیبی ترقی کسی ایک خطے میں کافی عرصے تک محدود رہتی تھی۔

زبان وادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی شعور کی بھی ترقی ہوئی، اس کے کلچر کی ترجمانی سب سے بہتر طریقے پر اس کے فنون لطیفہ کے طریقے سے ہوئی اور فنون لطیفہ میں سب سے اعلیٰ درجہ ادب کا ہے۔ ادب صرف مسرت ہی عطا نہیں کرتا بلکہ بصیرت بھی عطا کرتا ہے، ادب زندگی کا اظہار ہے، وہ معاشرے کے ظاہر اور باطن کا آئینہ ہے، بقول احتشام حسین:

> ”اعلیٰ ادب ادیب کی شعوری خدمات کا نتیجہ ہوتا ہے، اچھا ادب وقتی چیز ہوتے ہوئے بھی

> ہر وقت کی چیز ہوتا ہے، اس لیے اس میں انسانی شخصیت کی جو بالیدگیاں اور امکانات
> چھپے ہوتے ہیں انہیں بھی دیکھنا چاہئے۔''

ان تمام حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے، کہ شاعر یا ادیب اپنے سماج کا پروردہ ہوتا ہے، اور سماج کے اقدار اثر اس کا مزاج قبول کرتا ہے، لہذا وہ جو کچھ لکھتا ہے اس پر اس کی سماجی قدریں غالب ہوتی ہیں، اس میں شک نہیں کہ انسان ذاتی خیالات اور نظریات اس کی تخلیقات میں جھلکتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ اپنی سماجی قدروں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اردو کے داستانی ادب میں جو کچھ لکھا گیا ان کے واقعات مافوق الفطرت، کردار مثلاً جن بھوت اور پری وغیرہ اور جانور، مقفیٰ اور مرصع عبارت جو داستان گوئی علمیت کی عکاسی کرتی ہے، ایسے داستانی واقعات بظاہر سماجی زندگی سے الگ نظر آتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان داستانوں میں جو سماجی پہلو شامل ہیں مثلاً رہن سہن، آداب معاشرت، شادی بیاہ، تقریبات لباس، پوشاک، زیورات، خوردونوش وغیرہ اس دور کے اعلیٰ طبقے کی سماجی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں، اسی طرح افسانوی ادب میں قصے کہانیاں افسانے اور ناول، ناٹک اور ڈرامے وغیرہ میں عصری عہد کی سماجی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے، اسی طرح عصری ادب میں سماجی حالات کے ساتھ کہیں کہیں تاریخی پہلو بھی شامل ہوتے ہیں، یعنی ادیبوں نے تو تاریخی حقائق پر مشتمل ناول لکھے ہیں، افسانوی ادب سے قطع نظر غیر افسانوی ادب میں بھی یہ صورتِ حال دکھائی دیتی ہے، خاص طور پر سفرنامے اور خطوط وغیرہ میں ایسے تاریخی واقعات مل جاتے ہیں، چنانچہ مرزا غالب کے خطوط ان کے عہد کے بعد ایسے تاریخی واقعات کی نشاندہی کرتے ہیں جن کا ذکر تاریخی کتابوں میں بھی نہیں ملتا ہے۔

غرض کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ادب سماج کا پروردہ ہوتا ہے، جو اپنے عہد کے کلچر کی عکاسی کرتا ہے، گویا مجموعی طور پر سماج ادب کی تخلیق کے لیے مواد فراہم کرتا ہے، اور ادیب یا شاعر اپنی تخلیقات میں اپنے عہد کے سماجی حالات اور کلچر کی عکاسی کرتا ہے۔

17.3.4 ماحصل

17.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ نے:

- غالبؔ کے حالات زندگی اور ان کے افکار و خیالات سے واقفیت حاصل کی۔
- غالبؔ کے عہد کی سیاسی صورتِ حال کا پسِ منظر سمجھا۔

- غالبؔ کے عہد کے سماجی صورتِ حال کو جاننا۔
- غالبؔ کے عہد کی تہذیبی صورتِ حال سے واقف ہوئے۔

17.5 اپنا امتحان آپ خود لیجیے

۱۔ غالبؔ اپنی زندگی میں کن کن حالاتِ واقعات سے دوچار ہوئے؟

۲۔ غالبؔ کے عہد کا سیاسی پس منظر کیسا تھا؟

۳۔ غالبؔ کے عہد کے سماجی حالات کیسے تھے؟

۴۔ غالبؔ کے عہد کے تہذیبی صورتِ حال پر روشنی ڈالیے۔

۵۔ غالبؔ کے سفر کلکتہ کی وجہ بتائیے۔

17.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ غالبؔ مختلف حالات و واقعات سے دوچار ہوئے۔ غالبؔ کی زندگی کشمکش اور پریشانی میں گذری، وہ غم زندگی اور غم روزگار سے دوچار تھے۔ انہیں اندوہ پرور اور ہل چل سے پھرا ہوا زمانہ ملا۔ فنِّ شاعری میں ان کے بہت حریف تھے۔ غالبؔ سے قبل اردو شاعری رسمی اور تقلید کی پابندی تھی، غالبؔ نے اسے توڑ کر آزاد کیا۔

۲۔ غالبؔ کا عہد سیاسی افراتفری اور قومی انتشار سے بھرا تھا، مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو رہا تھا، انگریزوں نے ملک کے معاشی حالات بد سے بدتر کر دیے تھے۔ دہلی کی عوام اپنی جان مال کی حفاظت کے لئے در بدر بھٹکنے لگے تھے۔ غالبؔ کا عہد تبدیلیوں کا تھا۔

۳۔ غالبؔ کے خطوط سماجی حالات پیش کرتے ہیں، لوگوں کا رہن سہن، باہمی تعلّقات، ایک دوسرے کے غم و خوشی میں شامل ہونے وغیرہ کے حوالے ملتے ہیں۔ دہلی کا لال قلعہ، جامع مسجد، چاندنی چوک دہلی کی سماجی زندگی کا حصہ تھے۔ کئی چھوٹے بڑے واقعات ان کے خطوط میں ملتے ہیں۔ سماجی حالات کے بارے میں پتہ دیتے ہیں۔

۴۔ غالبؔ کے عہد میں سماجی، معاشرتی، اور سیاسی، کشمکش، تغیّر اور تبدیلی بدلاؤ کا قانون ہے، اس بدلاؤ کا اثر تہذیب و تمدن پر پڑنا لازمی ہے لہٰذا انسامی معاشرے اور تہذیب کی شکل میں زبان و ادب کا اہم رول ہوتا ہے۔ اگر انسان زبان و ادب سے بے بہرہ رہتا ہے تو اس کی تہذیبی و تمدنی ترقی رک جاتی

ہے، شاعر یا ادب اپنے سماج کا پروردہ ہوتا ہے اور سماج کے اقدار اِثر اس کا قبول کرتا ہے۔ وہ جو کچھ لکھتا ہے، اس پر اس کی سماجی قدریں غالب ہوتی ہیں۔

۵۔ جب غالب کی انگریزوں نے پینشن بند کر دی اور انہیں مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تو وہ کلکتہ کے سفر پر ملکہ وکٹوریہ سے ملنے اپنی پینشن بحال کرانے گئے لیکن اس نے منع کر دیا۔

17.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
ثقافت	:	تہذیب، کلچر
گنجینہ	:	خزانہ
ترک	:	چھوڑنا
سکونت	:	رہائش
خشت	:	اینٹ، ٹکڑا
مروّج	:	رائج کیا گیا
داغِ مفارقت	:	جدائی کا صدمہ
اقتصادی	:	مالی
مستحسن	:	پسندیدہ
عصر	:	زمانہ، وقت
جہت	:	سمت
مصاحب	:	دوست
گردوپیش	:	آس پاس

تسخیر : زیر کرنا

پروردہ : پالا ہوا

خورد و نوش : کھانا پینا

شہرہ : شہرت

عُسرت : تنگی

استغراق : کسی خیال میں ڈوبنا

فقدان : کمی

انجماد : جماؤ، ٹھرا ہوا

مضمرات : چھپے ہوئے

جاوداں : ہمیشہ زندہ رہنے والا

17.8 کتب برائے مطالعہ

ا۔ غالب کے خطوط : مرتبہ خلیق انجم

۲۔ تاریخ ادب اردو : جمیل جالبی

۳۔ داستان تاریخ اردو : حامد حسین قادری

۴۔ غالب اور عہد غالب : مرتبین شاہد ماہلی/ رضا حیدر

۵۔ انگریز کا شرمناک دور حکومت : شوکت علی فہمی

اکائی 18 عہدِ غالب کا شعری منظر نامہ

18.1 تمہید

18.2 اغراض ومقاصد

18.3 عہدِ غالب کا شعری منظر نامہ

18.4 نمونہ امتحانی سوالات

18.5 خلاصہ

18.6 فرہنگ

18.7 سفارش کردہ کتب

18.1: تمہید:

اس اکائی میں عہدِ غالب کے شعری منظر نامے سے متعلق طلبہ کو جانکاری دی جائے گی۔ عہدِ غالب کئی معنوں میں ایک عبوری دور تھا، جس میں سیاسی، سماجی اور معاشرتی تغیر کے ساتھ شاعری کے منظر نامے میں بھی نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔ طلبہ کے لیے اس اکائی کا خلاصہ بھی پیش کیا جائے گا۔ بطور نمونہ امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں۔ مشکل الفاظ کے معنی اکائی کے حصہ فرہنگ میں تلاش کیے جاسکتے ہیں اور آخر پر سفارش کردہ کتابوں کی فہرست طلبہ کے مزید مطالعے کے لیے موجود ہیں۔

18.2: اغراض ومقاصد:

ا۔ اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ:
عہدِ غالبؔ کے شعری منظرنامے کو سمجھنے کے قابل ہوسکیں۔

۲۔ طلبہ عہدِ غالبؔ کے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی نشیب وفراز سے واقفیت حاصل کریں۔

۳۔ عہدِ غالب کے اہم رجحانات اور شعری اسالیب سے واقف ہوں۔

18.3: عہدِ غالب کا شعری منظرنامہ:

عہدِ غالبؔ کے شعری منظرنامے پر بحث کرنے سے قبل طلبہ کو یہ جان لینا ضروری ہے کہ غالب ایک عہدِ آفریں شخصیت کا نام ہے۔ غالب کا عہدِ ہندوستان کی تاریخ میں ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی ''ان کو کسی خاص دور میں شامل نہیں کیا جاسکتا وہ خود ایک دور، ایک عہد یا ایک مزاج ہیں''۔ اس لیے عہدِ غالب کے شعری منظرنامے کو سمجھنے سے پہلے عہدِ غالب کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔

عہدِ غالب ہندوستانی تاریخ میں ہی نہیں بلکہ تاریخ عالم میں بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ۱۷۹۷ء میں یعنی غالب کی سال پیدائش سے پہلے ہی مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹا رہا تھا۔ اورنگ زیب کی وسیع وعریض مملکت سمٹ کر محدود ہو چکی تھی۔ ۱۸۰۳ء کو انگریز سپہ سالار لارڈ لیک کو جب شاہ عالم نے اپنے دربار میں بلایا جو اس بات کا غمازی تھا کہ اب سے برطانوی تسلط کا زریں دور مستقل بنیادوں پر قائم ہونے جا رہا ہے۔ مغل شہنشاہوں کو انگریزوں نے وظیفہ خوار بنا دیا اور گزارے کے لیے ساڑھے گیارہ لاکھ روپیہ بطور وظیفہ مقرر کیا۔ انگریزوں کو اب سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا نیز مغل بادشاہ کو محض اس خوش فہمی میں مبتلا رہنے کی اجازت دے دی گئی کہ وہ ازروئے قانون فرماں روائی کریں گے۔ بس بات ہر خاص وعام میں یہ مشہور ہوتی گئی

سلطنتِ شاہ عالم از دہلی تا پالم

غالب کی تخلیقت کا ماخذ جس عہدِ میں تیار ہو رہا تھا وہ غیر یقینی صورت حال، سیاسی اور سماجی انتشار کا دور تھا۔ تغیرات اور تبدیلیوں کی معروضی قوتیں برسرِ پیکار تھیں لیکن یہ خارجی قوتیں ابھی مضمر انداز میں اپنے مذموم مقاصد کے لیے راہ ہموار کر رہی تھے۔ مغلوں کی سیاسی وحدت کو کمزور اور اپنے سیاسی تسلط کو مستحکم کرنے کے لیے خارجی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں پیہم جاری تھیں۔ خطاب و القاب اور دیگر حقوق کی برقراری کے ساتھ ملحقہ بادشاہت کی یہ نگری ناامیدی، مایوسی اور خستہ حالی کی طرف جا رہی تھی یعنی مغلوں کے غروب آفتاب کی یہ روشنی بتدریج خود ہی گم نامی کے اندھیرے میں گم ہو رہی تھی۔ یہاں دوسری طرف انگریز واقعات کی رفتار بڑھانے کے فراق میں بے قرار تھے۔ غالبؔ ۱۸۵۴ء کو اپنے ایک خط میں اس غیر مستحکم صورت حال کا یوں خاکہ کھینچتے ہیں ”قلعے میں معدودے چند شہزادے اکٹھا ہوتے اور اپنے اشعار پڑھتے ہیں۔ کبھی کبھی میں بھی محفل میں شریک ہو جاتا ہوں۔ یہ صحبت بھی کچھ ہی دنوں کی ہے۔ کون جانتا ہے شعراء پھر کب اکٹھا ہوں گے یا اکٹھا ہوں گے بھی“۔ مختصر یہ کہ مغل شاہی خاندان کے نظام کا خاتمہ ہو گیا اور سلطنت کے آخری چراغ بہادر شاہ ظفر کو جلاوطن کر دیا گیا لیکن دوسری جانب اس وقت دھوم دھام کے ساتھ برطانوی امن کا ڈھنڈورا دیا جا رہا تھا ان واقعات اور حادثات پر شاہین کی نظر رکھنے والا شاعر مرزا غالب اس ازلی وابدی حقیقت کے اظہار کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے:

غرۂ اوج بنائے عالم امکان نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

اصل موضوع:

عہدِ غالب کے شعری منظرنامے کی جڑیں غالب کے پیش رووٴں سے ہی پیوستہ ہیں۔ ولی، سودا، درد، مصحفی، میر وغیرہ سے اردو شاعری کا منظرنامہ بتدریج آگے بڑھتا گیا لیکن عہدِ غالب کو سمجھنے کے لیے اردو شاعری کے ارتقائی سفر کو دیکھنا ضروری ہے۔ دہلی کو تاریخ، تہذیب، علم وفن، زبان وادب، شعروشاعری میں ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔

۱۷۷۹ء کو ولؔی کا دیوان دہلی پہنچا تو عام بول چال کی زبان میں شعروشاعری کرنے کا رواج پا گیا۔ یہی سے ریختہ خواص و عام کو عزیز ہوتی گئی اور آگے چل کر اردو کہلائی۔ اس دور کے خاص شعراء خان آرزو، حاتم، شاکر ناجی، مضمون، بیان، امید، مخلص وغیرہ ہیں۔ ایہام گوئی اس دور میں شاعری کے لیے رکاوٹ بنی مگر اس کے خلاف ردعمل کا آغاز ہوا جس کا سہرا حاتم، میر، مرزا مظہر جان جاناں اور یقین کے سر جاتا ہے جنھوں نے اردو شاعری کو ترقی کی منزلوں سے ہمکنار کرنے کے لیے اردو شاعری کو ایہام گوئی کے حصار سے آزاد کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ولی شاعری کا یہ مقام تھا کہ دہلی پہنچتے ہی اسے ہر کسی نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُن کی مقبولیت چاروں اور ہوئی۔ وہاب اشرفی لکھتے ہیں؛

> ''ولی جب دہلی آئے تو اپنے ساتھ اپنی ثقافت کا سرمایہ بھی لائے۔ اس سرمائے میں ایرانی سکے یا Idioms کم سے کم تھے، ایسا نہیں ہے کہ ولی سے پہلے دکھنی علاقے میں فاری اور فارسی شاعری سے لوگ واقف نہیں تھے لیکن یہاں کے شعرا کی جڑیں اپنے لسانی نظام میں تھیں جو دوسرے لسانی نظام سے متصادم نہیں ہوئی تھی۔ ادھر شمال میں بیرونی تسلط کے تحت اشرافیہ ریختہ سے زیادہ فارسی پر زور دے رہا تھا۔ ولی کے پاس مقامی وراثت تو تھی ہی جب انھیں ریختہ کہنے کی ہدایت کی گئی تو ان کے مقامی رنگ کو ایک اور سمت مل گئی۔ فارسی نے ان کی مدد کی اور شمال کے ڈکشن نے ان کے رنگ کو مزید چوکھا کر دیا، گویا اسلوب اور ڈکشن کا یہ منظر نامہ جو ولی کے یہاں ہے اس ثقافتی وسعت کا نتیجہ ہے جس کی جڑیں ہندوستان کے ایک وسیع علاقے سے لے کر ایران تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ولی کی زبان میں فطری طور پر وسعت پیدا ہو گئی اور ساتھ ساتھ مضامین کے تنوع میں بھی خاصا اضافہ ہو گیا''۔
>
> (وہاب اشرفی، ولی کا تہذیبی ورثہ اور ان کی شاعری، ولی: تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر، مرتبہ گوپی چند نارنگ، ساہتیہ اکادمی، ص ۴۵۔)

ولؔی اور ان کے معاصرین کے بعد غالؔب کے پیش روؤں میں میرؔ اور سوداؔ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سے کلاسکی اردو شاعری ایک نئی راہ پر گامزن ہوئی۔ میر اور سودا کا دور ایک ہی تھا میر نے دہلی کی بربادی دیکھی اور ذاتی طور پر بھی اپنی ساری زندگی آلام و مصائب میں گزار دی۔ جس کا عکس ان کے کلام میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ میر کا دور آپ بیتی سے جگ بیتی بن گیا۔ سودا کی طبیعت میر سے مختلف تھی جو بربادی اور غم کو ہنسی میں اڑا دیتے ہیں۔ دہلی کی بربادی پر شہر آشوب لکھ کر مذاق اڑایا۔ اردو قصیدہ نگاری میں سودا ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ میر اور سودا کے عہدِ کا اختصاص یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، غزل جیسے اصناف شاعری کو فروغ ملا۔ ان کے دور میں اردو شاعری نے زبان و بیان کے لحاظ سے ترقی پائی اور شاعری کو صفائی اور جزبات کی صداقت سے آراستہ کیا۔ بقول نیاز فتح پوری ''زبان و بیان کے لحاظ سے غزل گوئی نے اس زمانے میں بڑی نمایاں ترقی کی اور نہ صرف سودا و میر بلکہ اس عہدِ

کے جس شاعر کا کلام اٹھا کر آپ دیکھیں گے تو زبان کی صفائی اور جذبات کی صداقت آپ کو ہر جگہ نظر آئے گی''۔

یہاں تک کہ دہلی کی شاعری کا روایتی رنگ ولیؔ سے لے کر میرؔ کے عہد تک ایک ہی آہنگ رکھتا ہے لیکن سوداؔ نے غزل کی تکنیک میں تنوع پیدا کر کے اس کو کئی تبدیلیوں سے آراستہ کیا۔ اس حوالے سے احمد محفوظ کچھ یوں لکھتے ہیں؛

> ''میر تقی میر (۲۲۷۱ تا ۰۱۸۱) کی شہرت اور مقبولیت کی بنیاد زیادہ تر ان کی غزلوں پر قائم کی گئی ہے۔ سب سے پہلے تذکرہ نویسوں نے میر اور سودا کا تقابل کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ یوں تو دونوں شاعروں کا مرتبہ یکساں ہے، لیکن غزل کے میدان میں میر کو سودا پر فوقیت ہے اور قصیدے میں سودا کو میر پر سبقت حاصل ہے۔ زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ خیال اس قدر بافتہ اور مستحکم ہو گیا کہ عموماً لوگوں نے میر کی شاعری کا مطالعہ ان کی غزلوں تک ہی محدود کر لیا۔''
>
> (احمد محفوظ، کلیات میر، جلد دوم، قومی کونسل برائے اردو زبان، نئی دہلی، ص ۱۵۔)

اس عہد میں منفرد اور مخصوص طرز انداز رکھنے والے شاعر نظیر اکبر آبادی بھی موجود ہیں جو میر کے ہم عصر ہیں میر ہی کی طرح انھوں نے بھی کسی رجحان یا دبستان کی تقلید نہیں کی۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان کی شاعری کا رشتہ ہندوستان کی تہذیبی میراث سے مربوط اور مستحکم ہے۔ انھوں نے ایک شاعر کی حیثیت سے اپنی روایتوں کا رس خوب پیا ہے۔ نظیر کا مطالعہ وسیع تھا، ان کے موضوعات غزل کی ساخت میں سما نہیں سکے، اس لیے انھوں نے نظم نگاری سے کام لیتے ہوئے اپنے خیالات کی وسعت کو بام عروج بخشا۔ لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ نذیر نظم کے مقابلے میں غزل میں زور بیان اور ذخیرہ الفاظ پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہو:

نزاکت اور لطافت وہ ، کف پا تک کہ حیراں ہوں
سمن، گل لالہ ، نسرین ، نسترن، در، پرنیاں ، مخمل
نظیر اک عمر عشرت ہو ، ملے ایسا پری پیکر
اگر اک آن ، اگر اک دم ، اگر اک چھن ، اگر اک پل

غرض دہلی کی بربادی سے قبل عہدِ میر، سودا اور نظیر تک اردو شاعری کا رنگ ایک جیسا ہی رہا مگر جذبات کا داخلی رنگ اس میں صاف اور غالب نظر آتا ہے۔ اردو شاعری کے اس دور کو ہمیشہ وقار کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

عہدِ غالب کی ابتدا سے قبل ہی دلی سیاسی افراتفری کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ انتشار و اضطراب کا ایک روح فرسا ماحول قائم ہو چکا تھا اور اب یہاں گزارا کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ یہاں کی آسودگی، رنگینی اور نشاط آمیز ماحول نے شعراء کی تخلیقی حیثیت کو متاثر کیا اور شاعری کے جدید رجحان کو اپنے دامن حصار میں لے لیا۔ دہلی کی شاعری کا جو خاصہ غم اور محبت تھا اب لکھنؤ آ کر نشاط رندی میں تبدیل

ہوگیا۔ دبستان دہلی میں فلسفہ وحدت الوجود اور تصوف کا اثر گہرا نظر آتا ہے کیونکہ دہلی صوفیا کا اول سے ہی مرکز رہا ہے۔ میر، سودا، درد اور مرزا غالب کی شاعری میں تصوف کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔ دبستان دہلی میں تصنع اور بناوٹ نہیں بلکہ تشبیہات و استعارات کا استعمال دلکش پیرائے اور سادگی سے ہوا ہے۔ یہاں داخلی واردات کے بیان کی آمیزش حسن و عشق کے خارجی معاملات کے بہ نسبت زیادہ ملتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہو:

تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا
(میر)
پردے کو تعین کے در دل سے اٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا
(سودا)
ڈھونڈے ہے تجھے تمام عالم
ہر چند کہ تو کہاں نہیں ہے!
(درد)
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
(غالب)

دبستان دہلی کے شعراء وصال سے زیادہ ہجر کے مشتاق نظر آتے ہیں۔ عشق و عاشقی ان کی شاعری کا موضوع خاص رہا ہے باوجود اس کے وہ پاکیزگی کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے سے اور دہلی کی بربادی کے بعد شعر و سخن کا مرکز لکھنو قرار پایا۔ غزل گوئی کو لکھنو کی رنگینیوں نے متاثر کر دیا۔ دبستان لکھنو نے داخلی واردات کے بجائے خارجی معاملات کو پیش کیا۔ جنسی جذبات کا اظہار یہاں عیب نہیں سمجھا جاتا، زبان میں لطافت پیدا کرنا ان کا مشغلہ بنا جس سے یہاں کی زبان دہلی سے زیادہ دل آویز نظر آنے لگی۔ یہاں کی رنگین فضا میں تصوف کے لیے جگہ نہیں، عیش و عشرت اور فارغ البالی نے لکھنو کی شاعری میں نشاطیہ رنگ بھر دیا۔ میر حسن، سوز، سودا، انشاء، مصحفی، ناسخ وغیرہ دبستان لکھنو کے اہم شعراء ہیں۔ دبستان لکھنو کے کچھ اشعار نمونے کے طور پر دیے جاتے ہیں تا کہ طلبہ اُس عہد کے دبستان دہلی اور دبستان لکھنو کے شعر و سخن میں فرق کو واضح کر سکیں گے۔

تھا جی میں کہ دشواری ہجر اس سے کہیں گے
پر جب ملے کچھ رنج و محن یاد نہ آیا
(جرات)
گیا وہ چھوڑ کر رستے میں مجھ کو
اب اس کا نقش پا ہے اور میں ہوں
(ناسخ)
نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں
(انشاء)

کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد دہلی کی رونق پھر سے لوٹ آئی اور محفلیں آراستہ ہونے لگیں۔ اب جس دور کا آغاز دہلی میں ہو رہا تھا یہ اردو شاعری کا دور عروج کہلاتا ہے۔ غالب اور ان کے معاصرین میں شاہ نصیر، ذوق، مومن اور بہادر شاہ ظفر نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ شاہ نصیر لکھنو کئی مرتبہ گئے اور ناسخ و آتش کے رنگ میں رنگنے لگے۔ خارجیت، تصنع، رعایت لفظی اور زور بیان جیسی خصوصیات شاہ نصیر کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ یہی خصوصیات لے کر وہ جب دہلی پہنچے تو دہلی کے شعراء نے بھی انھیں اپنانے کی کوشش کی، یہاں تک کہ غالب بھی لکھنوی رنگ میں کچھ دیر کھو گئے لیکن اس رنگ کو اپنے مزاج کے موافق نہیں پایا اور جلد ہی دبستان دہلی کے مزاج کی جانب مراجعت کی۔ شاہ نصیر نے فن شاعری میں ایسا نام پیدا کیا تھا کہ ذوق، مومن، ظفر اور آرزو نے ان کی شاگردی اختیار کی۔

ہمیں اس اکائی میں غالب کے معاصرین سے بھی استفادہ کرنا لازمی ہے تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ عہدِ غالب میں غالب کے معاصر شعراء کی شاعری کا امتیاز کیا تھا۔ غالب کے معاصرین میں خاص طور پر شیخ محمد ابراہیم ذوق کا نام آتا ہے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم غلام رسول شوق کے مکتب میں حاصل کی، ان کے بعد مولوی میاں عبدالرزاق سے درسیات کی تکمیل کی۔ ان ہی کے مدرسے میں آزاد کے والد ماجد مولوی محمد باقر سے ملاقات ہوئی۔ ابتدا میں وہ شوق سے اصلاح لینے لگے اور انہی کے مشورے سے ذوق تخلص اختیار کیا۔ ان کے بعد وہ شاہ نصیر سے اصلاح لینے لگے لیکن ان کی طرف شاہ نصیر کی توجہ کم رہتی تھی۔ جو غزلیں ذوق اصلاح کے لیے لاتے تھے شاہ نصیر انہیں یہ کہہ کر طبیعت پر خوب زور ڈالو اور مزید غور و فکر کرو پھر واپس کرتے تھے۔ ذوق ان سے دل برداشتہ ہوتے تھے لیکن دوست واحباب ہمت بندھاتے اور مشاعروں میں پڑھنے کا مشورہ دیتے۔ اس طرح ذوق کی مشقِ سخن جاری رہی۔ شاہ نصیر اور ذوق کے درمیان چشمک بھی خوب رہتی تھی۔ جب شاہ نصیر حیدر آباد چلے گئے تو

ان کے کچھ شاگرد ذوق سے اصلاح لینے لگے جن میں نواب الٰہی بخش خاں معروف خاص کر قابلِ ذکر ہیں جن کی وجہ سے ذوق کو شہرت ملی۔ ذوق بہادر شاہ ظفر کی ولی عہدی کے ساتھ ہی قلعے سے وابستہ ہو گئے، شاہ نصیر نے میر محمد کاظم کے لیے قلعے میں جانے کا موقع فراہم کیا تھا انھوں نے یہ موقع ذوق کے لیے فراہم کیا۔ بادشاہ کی طرف سے انہیں ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ شاہ نصیر کے سلسلے سے وابستہ ہونے کی بنا پر ذوق کا رنگِ سخن دلی پر حاوی ہو گیا اور بادشاہ کا استاد ہونے کہ وجہ سے بھی کئی شعرا ان سے وابستہ ہوتے گئے۔ ذوق کا مطالعہ واقعی وسیع تھا۔ ان کی شاعری میں فکر کی آمیزش تو ہے لیکن یہ بے ساختہ اور ثقیل ہے۔ اندازِ بیان سادہ تو ہے لیکن سپاٹ ہے جہاں الفاظ کو جوڑ کر اور ان پ]ر زور دے کر شعر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ذوق دراصل قصائد کے شاعر ہیں۔ سودا کے بعد قصیدہ نگاری میں ان ہی کا نام لیا جاتا ہے۔ قصیدہ چونکہ مدح ستائی پر مبنی صنف ہے لہٰذا اس میں شاعر زبان دانی کی دھاک بٹھانا چاہتا ہے۔ ذوق کی شاعری میں اسی زبان دانی کی دھاک ملتی ہے جو اس دور کا ایک اہم رجحان تھا اسی وجہ سے وہ اس دور کے اہم شعرا میں تسلیم کئے جانے لگے۔ غالب، استادِ شاہ ہونے کی وجہ سے ذوق کو اپنا حریف تسلیم کرتے تھے اور ان دونوں کے درمیان ادبی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔

نمونہ کلام:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

خوب روکا شکایتوں سے مجھے
تو نے مارا عنایتوں سے مجھے

مرضِ عشق جسے ہو اسے کیا یاد رہے
نہ دوا یاد رہے اور نہ دعا یاد رہے

عزیزو اس کو نہ گھڑیال کی صدا سمجھو
یہ عمر رِفتہ کی اپنی صدائے پا سمجھو

گہر کو جوہری ، صراف زر کو دیکھتے ہیں
بشر کے ہیں جو مبصر بشر کو دیکھتے ہیں

ذوق کے بعد غالب کے معاصرین میں مومن خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ نام حکیم مومن خان اور تخلص مومن تھا۔

1800ء میں دہلی میں پیدا ہوئے انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم شاہ عبدالقادر صاحب کے مدرسے میں پائی اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے درس میں بھی شرکت کرتے تھے۔ انھوں نے فارسی زبان کی تعلیم عبداللہ خان علوی سے حاصل کی۔ اپنے خاندانی پیشے طب کی تعلیم اپنے والدِ ماجد غلام نبی خان اور چچا غلام حیدر خان سے لی۔ مومن نجوم، عملیات، رمل، موسیقی، شطرنج، اور ریاضی میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ بہت سا وقت عشق و عاشقی اور عیش پرستی میں گزارا، لیکن 1803ء میں سید احمد شہید کی بالاکوٹ میں شہادت کے واقعے نے ان کی زندگی کو بدل دیا اور موسیقیت سے توبہ کر کے صوم وصلاۃ کے پابند ہوگئے۔

کلب علی فائق کے بقول نو برس کی عمر میں انہوں نے شاعری شروع کی تھی۔ ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لی لیکن جب ناسخ کا کلام دلی پہنچا تو ان کی طرف مائل ہوئے اور بعد میں میر کا تتبع اختیار کیا۔ مومن بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں کیونکہ اس دور میں غزل ہی محبوب ومرغوب صنف تھی۔ لیکن بقیہ شعرا کی طرح انہوں نے قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رباعی اور واسوخت میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزل میں تغزل، داخلیت، نازک خیالی، ندرتِ اسلوب، مکر شاعرانہ جیسے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ ان کی غزل کے مضامین حسن وعشق کے معاملات کے گرد گھومتے ہیں۔ انہوں نے اس میں نسوانی پیکر کو پیش کیا جس کا ذکر ان کی غزل میں 'پردہ نشین' کے عنوان سے ملتا ہے۔ معاملہ بندی بھی مومن کی غزل کی بڑی خصوصیات میں شمار کی جاتی ہے۔ حسینوں سے چھیڑ چھاڑ، رقیب سے اپنے رویے کا اظہار، وصل وہجر کی داستان معاملہ بندی میں بیان کیے جاتے ہیں۔ شاعری بیان کی شوخی اور عشق کے جذبے سے مغلوب ہوکر اگر ناگفتنی کو گفتنی بنادے تو معاملہ بندی نازک مرحلہ بن جاتا ہے۔ ایسی ہی نازک خیالی مومن کی غزل کی اہم خصوصیت ہے۔ انہوں نے اس نازک خیالی میں ندرتِ اسلوب اور شاعرانہ شوخی کو استعمال کیا ہے۔ مکرِ شاعرانہ کے لیے بھی مومن جانے جاتے ہیں۔ اس صنعت کو انہوں نے خوبی سے برتا ہے۔ انہوں نے تشبیہات واستعارات اور صنائع وبدائع کو بھی خوبی سے نبھایا ہے۔

مومن نے چھ مثنویاں 'شکایتِ ستم، قصہ غم، قولِ غمیں، تفِ آتشیں، حنینِ مغموم، آہ زار، مظلوماں' لکھیں ہیں۔ ان تمام مثنویوں کے موضوعات عاشقانہ ہیں۔ ان کے قصائد کی تعداد نو ہے جو زیادہ تر مذہبی شخصیات پر مبنی ہیں۔ فکر کی سطح پر دیکھیں تو غالب کی یہاں ہمہ گیر نظر آتی ہیں اور مومن کی فکر کا دائرہ ومحور محدود ہے۔ غالب حیات وکائنات کے وسائل پر ایک حکیم، فلسفی اور دانشور کی طرح غور کرتے ہیں اور اس غور وفکر کو اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں اور مومن ایک عام راہ گیر کی طرح گزر جاتا ہے جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے اس کو بیان کرتا ہے۔ اس میں وہ مشکل الفاظ واصطلاحات کو استعمال کرتا ہے لیکن مشکل الفاظ کسی کلام میں گہرائی پیدا نہیں کرسکتے۔ اسلم پرویز نے یہ بات صحیح لکھی ہے کہ 'مومن کی شاعری کا صرف ایک پہلو ایسا ہے جہاں وہ شعرائے متقدمین اور ہم عصر شعراء سے ممتاز نظر آتے ہیں اور وہ ہے ان کی عشقیہ شاعری'۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس شعر کے بارے میں مشہور ہے کہ غالب نے کہا تھا کہ اگر مومن مجھے یہ شعر دیں تو میں اپنا پورا دیوان دوں گا۔ نمونہ کلام:

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی
کیا جانے کیا لکھا تھا اسے اضطراب میں
قاصد کی لاش آئی ہے خط کے جواب میں
نہ کرو اب نباہ کی باتیں
تم کو اے مہربان دیکھ لیا
ہو گیا راز عشق بے پردہ
اس نے پردہ سے جو نکالا منہ
ہو گئے نام بتاں سنتے ہی مومن بے قرار
ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں
میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

مومن کے کلام میں اچھوتا پن ہے۔ مومن ابہام سے اپنے کلام میں حسن پیدا کرتے ہیں لیکن کثرت ابہام سے بعض جگہوں پر معنی ادا نہیں ہوتا ابہام یہاں عیب بن جاتا ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی ''ابہام شاعری کی بہت بڑی خوبی اور تنقید کی سب سے بڑی لعنت ہے کیونکہ شاعری میں تو ابہام نئے نئے معنی کے دروازے کھولتا ہے اور تنقید میں ابہام کے باعث نفس مطلب کا دم گھٹ جاتا ہے''۔

عہدِ غالب کے دیگر شعراء میں بہادر شاہ ظفر، شیفتہ، حالی وغیرہ نے بھی عہدِ غالب کے شعری منظرنامے میں اپنا حصہ ڈالا۔ ظفر شاعر اور شاعروں کے قدرداں تھے ان کی زبان پر ہندی کے اثرات اور ترنم دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ فن موسیقی میں ید طولیٰ رکھتے تھے جس سے ان کے کلام میں اچھوتا پن پیدا ہوتا ہے۔ شیفتہ اور حالی کا شمار اردو شاعری کے صاف اور خوش گو شعراء میں کیا جاتا ہے انھوں نے اصلاحی شاعری کو صاف انداز بیان کا جامہ پہنایا۔ شیفتہ کی صاف گوئی کا اندازہ ان کے اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے:

نہ دیا ہائے مجھے لذت آزار نے چین

دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا

خود غالب اپنے عہدِ کے نامور شاعر گزرے ہیں انھوں نے اردو شاعری کو ایک نئے آہنگ سے آراستہ کیا۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ ''غالب سے پہلے اردو شاعری دل والوں کی دنیا تھی، غالب نے اسے ذہن دیا''۔ غالب نے غزل میں نئے موضوعات شامل کر کے اسے وسعت بخشی۔ غالب کی مشکل پسندی، فارسی الفاظ کی کثرت سے نہیں بلکہ تخیل کی بلندی اس کا سبب تھا۔ عبادت بریلوی لکھتے ہیں کہ ''غالبؔ ایک بڑی رنگین، ایک بڑی ہی پرکار اور پہلو دار شخصیت رکھتے تھے اور اس رنگینی، پرکاری اور پہلو داری کی جھلک ان کی ایک ایک بات میں نظر آتی ہے۔'' یہ قول رشید احمد صدیقی کا ہے ''مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا؟ تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا غالبؔ، اردو اور تاج محل۔'' بہ قول ڈاکٹر محمد حسن ''دیوان غالبؔ کو ہم نئی نسل کی انجیل قرار دے سکتے ہیں۔'' بہ قول ڈاکٹر عبادت بریلوی ''اردو میں پہلی بھرپور اور رنگا رنگ شخصیت غالبؔ کی ہے۔'' ان کے کلام کی خصوصیات میں تہہ داری، شوخی و ظرافت اور غور و فکر کا انداز ملتا ہے۔ غالب فلسفی نہیں تھے لیکن فلسفیانہ انداز رکھتے تھے۔

شکن زلف عنبریں کیوں ہے
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہے
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

غالبؔ کی شاعری اور نثر اپنے زمانے کے پس منظر میں نئی نسل کے لیے مطالعے کا ایک اہم ترین موضوع ہے۔ غالبؔ کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہر زمانے میں موجود رہیں گے۔ باقی شعرا سے قدرے مختلف ہونے کے بدولت اُن کی شاعری میں تنوع اور رنگا رنگی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اسی طرح غالبؔ کی روشن خیالی اور آزادہ روی ہمارے زمانے کی نمائندگی کرتی ہے۔ دراصل غالبؔ زندگی کے ہر شعبے میں تجدید پسندی اور انفرادیت کے قائل نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مستقبل کے سارے امکانات چھپے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ تشکیک، استفہام، تجسس اور انفرادیت کی وہ ساری چیزیں ان کے اشعار میں ملتی ہیں، جن کی ترکیب سے ایک ایسے زمانے کی تعمیر و تشکیل ممکن ہے، جو بہر حال غالبؔ کے بعد کا زمانہ اور ہمارے عہدِ سے ملتی جلتی صورت حال کی نمائندگی کرتا ہے لیکن یہ سب اُس عہدِ کا ہی عکس ہے جو غالب کی شاعری میں نمایاں نظر آتا ہے۔

اٹھارویں صدی کے دوران، فارسی ہندوستان میں ایک ادبی زبان کے طور پر بڑے پیمانے پر بولی اور استعمال کی جاتی تھی۔ یہ مغل دربار کی زبان تھی اور امرا اور دانشور بھی اسے استعمال کرتے تھے۔ مغل دور میں فارسی دربار کی سرکاری زبان اور انتظامیہ کی زبان

بن گئی۔ یہ ادب، شاعری اور دیگر سماجی علوم کی زبان کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھی۔ اس دوران فارسی میں ادب کی بہت سی اہم تخلیقات لکھی گئیں۔ فارسی نے ہندوستان کی ثقافتی اور سماجی زندگی میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ تاہم، اٹھارویں صدی کے آخر تک، ہندوستان میں فارسی کا استعمال کم ہونا شروع ہوا اور بالآخر برطانوی نوآبادیاتی دور میں انتظامیہ اور تعلیم کی زبان کے طور پر اس کی جگہ اردو کے بعد انگریزی نے لے ہی لی۔

عہدِ غالب میں فارسی زبان اور فارسی شاعری 'نقشہاے رنگ رنگ' تصور کی جاتی تھی ایسے میں غالب کو بھی اپنے فارسی کلام پر ناز تھا۔ غالب نے اپنے اردو کلام کو خود ہی ''برگ از نخلستانِ فرہنگِ من'' کہا اور دعویٰ کیا کہ یہ بے رنگ اردو شاعری کیا دیکھتے ہو۔ یہ تمھارے لیے باعثِ فخر ہوگی، میرے لیے تو موجبِ ننگ ہے۔ دیکھنا ہے تو میرا فارسی کلام دیکھو۔

نیست نقصان ، یک دو جزو است ار سوادِ ریختہ
کاں دژم برگ از نخلستانِ فرہنگِ من
فارسی بین ، تا بہ بینی نقشہاے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بے رنگِ من است
راست می گویم من و از راست سر نتواں کشید
ہر چہ در گفتار فخرِ تُست ، آن ننگِ من است
آنچہ گفتم از جہانے دیگر است
این کتاب از آسمانے دیگر است

غالبؔ کے کلام میں لفظ بولتے نظر آتے ہیں، انھوں نے مختصر لفظوں میں معنوں کے دفتر کھولے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لفظوں میں گنجینۂ معنی وا کرنے کے لیے اِنہوں نے فارسی لفظیات سے ایسے پیکر تراشے ہیں کہ لفظ آبِ رواں کی مانند نہ صرف دوڑتے ہیں بلکہ اس دوڑ سے سوزِ دروں پیدا کرتے ہیں۔ کیوں نہ ہو ان کے کلام میں رنگارنگی، ، فصاحت، بلاغت، روانی اور تہہ در تہہ جادوئی معنوی جادوئی ارتعاش پایا جاتا ہے۔ غالب نے بیدل کو اپنا استادِ فن مانا ہے، یہ بھی ایک وجہ ہے انہوں نے فارسی زبان سے کما حقہ استفادہ کیا ہے۔ بیدل فارسی زبان کے مسلم الثبوت اُستاد تھے، ان کے فکر و فن کی عظمتوں کو ہر کس و ناکس نے تسلیم کیا ہے۔ بیدل کے تخیل کی بلندی، فکر کی گیرائی و گہرائی، بندشِ الفاظ سے معنوں کا جو طلسمی دریا موجزن ہوتا ہے اُس کی مثال اردو شاعری میں ملنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ غالبؔ اردو شاعری میں ایک الگ ہی دنیا آباد کرنے جا رہے تھے، اس لیے انہوں نے ولیؔ اور میرؔ کا تتبع کرنے کے بجائے بیدل کے انداز میں طلاطم کرنے کی کوشش کی۔ غالبؔ نے شاعری میں مرزا بیدل کو ہی اپنا معنوی استاد منتخب کیا۔ غالب کی شاعری میں جیسے کلامِ بیدل الہام کی صورت بن کر ان کے شعورِ

تخلیق میں اس طرح جزب ہوا ہو۔ اسی طرح آپ کو کلام غالبؔ میں بھی جگہ جگہ طرز بیدلؔ میں ریختہ کی قیامت نظر آئے گی، کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب فارسی میں سوچتے ہوں اور پھر اس فارسی سوچ کو اردو میں تبدیل کر کے صفحہ قرطاس پر اتار رہے ہوں، کیونکہ ولیؔ سے میرؔ تک حتیٰ کہ ناسخ کی زبان دانی سے آتشِؔ مرصع ساز تک اس طرح کی ترکیبیں، پیکر، بندشیں، محاورے، کہاوتیں اور لفظوں کی تراش و خراش اُس عہد میں کہیں نہیں ملتی اور جب نظر غالبؔ پر جاتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے غالبؔ بیدلؔ کے وارث ہوں۔ وارث کرمانی لکھتے ہیں:

> ’’غالب اور بیدل کے باہمی رشتے کے بارے میں زیادہ صحیح رائے یہ ہوگی کہ غالب نے پچیس سال کی عمر تک بیدل کو اپنا اُوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔۔۔۔۔۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ انسان کی شخصیت اور طرزِ فکر کی تشکیل عمر کے ابتدائی حصے ہی میں ہوتی ہے۔ چنانچہ غالب کو جو کچھ ذہنی اعتبار سے بننا تھا پچیس سال کی عمر تک بیدل کے زیر سایہ بن چُکے تھے۔۔۔۔۔ بنیادی طور سے وہ (غالب) بیدل ہی کے ساختہ پرداختہ رہے۔ غالب کی شاعری کا فلسفیانہ اور فکر انگیز لہجہ بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ لہجہ ان مبہم استعاروں اور پیچیدہ بندشوں میں لپٹا ہوا ہے جو اٹھارویں صدی کے اوائل ہی میں وضع کی گئی تھی۔۔۔۔۔ چنانچہ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ غالب کے تصوف آمیز افکار، ان کا فلسفیانہ تجسس اور ان کے زمان و مکان کے باہر اُڑان بیدلؔ کے اثرات کا نتیجہ ہے۔‘‘

(کرمانی وارث، شعری وراثت، غالبؔ کی فارسی شاعری، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۲۱۔)

غالبؔ نے بیدلؔ سے تصوف کا فلسفہ تو سمجھا، لیکن تصوف کے اس سفر میں غالب نے بیدل کی رہنمائی قبول نہیں کی۔ ہمیں یہاں پر غالبؔ کے اس طریقہ تصوف سے انکار کو اس بات کے آئینے میں نہیں دیکھنا چاہئے کہ کہیں غالب نے بیدل کے تصوف کو ’’قیامت ہے‘‘ کی بنیاد پر دیکھا اور اس سے باہر نکل آئے، بلکہ غالب نے گوشہ نشینی کے بجائے وہ اُڑان بھر لی جہاں سے فکر اُن حدوں کو چھو آئی کہ عرش سے پرے لامکاں پر مکاں بنانے کے خواب بُننے لگے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ غالبؔ بیدل کے تصوف کے متوالے نہیں، بلکہ اس کی زبان و بیان، لہجہ، معنی آفرینی اور اسلوب کی تہ داری سے اپنی شعری کائنات کی ایک نئی کہکشاں دریافت کی، لیکن یہ طرز طریق عہدِ غالب کی شاعری کا خاصا نہیں تھا اور یہی وجہ کہ غالب کو اپنے زمانے میں وہ مقبولیت نصیب نہیں ہوئی جو اسے ملنی چاہئے تھی۔ اس حوالے سے حالی لکھتے ہیں:

> ’’لوگ عموماً میر، سودا، میر حسن، جرات اور انشا وغیرہ کا سیدھا سادا اور صاف کلام سننے کے عادی تھے جو محاورے، روزمرہ کی بول چال اور بات چیت میں برتے جاتے تھے انھیں کو اہل

> زبان وزن کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھتے تھے تو ان کو زیادہ لذت آتی تھی اور زیادہ لطف حاصل ہوتا تھا۔ شعر کی بڑی خوبی یہی کبھی جاتی تھی کہ ادھر قائل کے منھ سے نکلا اور ادھر سامع کے دل میں اُتر گیا مگر مرزا کے ابتدائی ریختے میں یہ بات بالکل نہ تھی۔ جیسے خیالات اجنبی تھے ویسی ہی زبان غیر مانوس تھی ... اکثر اشعار ایسے ہوتے تھے کہ اگر اُن میں ایک لفظ بدل دیا جائے تو سارا شعر فارسی زبان کا ہو جائے۔ بعض اسلوب بیان خاص مرزا کے مخترعات میں سے تھے جو نہ اُن سے پہلے اردو میں دیکھے گئے نہ فارسی میں۔''

(مولانا الطاف حسین حالی، یادگار غالب، ص۱۰۲، ۱۰۳۔)

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
بخشے ہے جلوہ گل، ذوق تماشا غالبؔ
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا
قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

یہی وجہ ہے کہ جب غالب نے اپنی شاعری کی شروعات کی تو اُنہیں تصویر میں طرح طرح کے پیکر نظر آنے لگے یوں لفظ کردار بنتے گئے جو اس کے پیچھے بھاگنے لگے اور اس نے لفظوں سے قدرے مختلف کام لیا اور یہ کام اُس عہدِ میں ایک دم انوکھا اور سمجھ سے باہر نظر آنے لگا، ایسی صورتحال میں ایسا کلام جو بالکل ہی غیر مانوس اور ایک طرح سے معیوب معلوم ہوتا ہو۔ جب غالب کو مُدت بعد دربار تک رسائی نصیب ہوئی اور اپنی سخن کو سخن کرنے موقع ملا، لیکن اُسے اپنی کاغذی تحریر کا لُو ہا منوانے کے لیے جوئے شیر لانے کی ضرورت پڑی۔ غالبؔ شاعری میں کسی نئی ہیت کا تجربہ لے کر نہیں آئے تھے، بلکہ خطابیہ تھی کہ اُن کا اسلوب نگارش ذرہ ہٹ کے تھا: وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''اس میں کوئی کلام نہیں کہ غالب دراصل بیسویں صدی کا انسان تھا جو غلطی سے انیسویں صدی میں پیدا ہو گیا اور اس بات کی اسے سزا بھی ملی۔ اس کی شاعری مہمل، اس کے اندازِ فکر کو نامانوس اور اس کے اسلوب حیات کو قابل اعتراض قرار دیا گیا۔ مگر جب غالبؔ تقریباً ایک سو برس کی مسافت طے کرنے کے بعد اپنوں میں پہنچا تو زمانے نے بانہیں کھول کر اس کا استقبال کیا۔۔۔۔ غالب کی شاعری جدید ذہن کو اس لیے عزیز ہے کہ اُس میں اسے اپنی یافت اور

> نایافت، انفرادیت اور اجتماعیت، ذہنی فعالیت اور تخلیقی اپج ایک ایسے احساس بحر آسا پر منتج ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، جو بعض اوقات تو کائناتی شعور کے مقام تک بھی جا پہنچتی ہے۔’’
>
> (آغا وزیر، ماہنامہ اوراق، خاص نمبر، مولانا صلاح الدین احمد کی یاد میں، جلد ۱۷، شمارہ ۵، ۶، غالب اور جدید ذہن، دفتر اوراق چوک اردو بازار لاہور، غالب، مدیران وزیر آغا سجاد نقوی، ص، ۳۲۵۔ بحوالہ ریختہ ڈاٹ کام ص ۲۳۸۔)

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ غالب کو اپنے زمانے میں وہ قدر و منزلت نصیب نہیں ہوئی جو اُنہیں ملنی چاہیے تھی اس پہ طرہ یہ کہ وہ تمام عمر ایک طرح کی نرگسیت کے نفسیاتی شکار رہے۔ تمام عمر خلعت، وظیفہ، خود بینی ایسی کہ ‘‘الٹے پھر آئیں گے درِ کعبہ’’ کے مترادف اور شاعری ایسی کہ خواص بھی بے بہرہ۔ حقیقتاً میں اگر غالب کی شاعری کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ اٹھارویں، انیسویں، بلکہ بیسویں صدی کو غالب کا عہد نہیں کہا جاسکتا، صحیح معنوں میں اکیسویں صدی غالب کی صدی ہے۔ غالب کو انسانی حیات کے متنوع گوشوں کا بڑی گہرائی و گیرائی کے ساتھ ادراک تھا، ایک فن کار کی طرح وہ زندگی کے باطن میں اتر جانے کا ملکہ رکھتے تھے اور انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو شدت سے محسوس کر کے اپنے تخیل کی رنگ آمیزی سے شاعری میں منتقل کرتے تھے۔

دراصل عہدِ غالب میں ہندوستان تہذیبی اعتبار سے نئی تقدیر لکھنے جا رہا تھا یہ تقدیر سازی آپ کو زندگی کے ہر شعبے میں صاف نظر آئے گی، اس زمانے میں ہندوستان میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ حصہ کلکتہ تھا اور غالب کو وظیفے کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر کرنا پڑا اور کلکتہ کے اس سفر نے غالب کی ایک الگ تقدیر لکھ دی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مغلوں کے دورِ عروج کی داستانوں کا قصہ پارینہ ہو چکا تھا، مگر جیسے جیسے وہ زمانہ دور ہوتا گیا اس احساس نے ذہن کے دریچوں کو وا کیا کہ ہماری تہذیبی کہانیاں ختم ہو چکی ہیں اور اب لوگوں کے سامنے دو ہی صورتیں تھی یا تو روایات کو تھامے رکھنا تھا یا پھر روایات سے بغاوت لازمی بن جاتی تھی اور اگر خالی اپنی روایات ہی کو تھامے رہتے اُس صورتحال میں آگے بڑھنے کے تمام راستے بند کرنے تھے۔ ایسے دور میں جب دو نظام ہائے زندگی کی کشمکش ہو رہی ہو، تو ایک عام بے یقینی، حیرت اور تشکیک کا ہونا لازم ہے۔ غالب نے اس صورت حال کا بغائر مطالعہ کرنے کے بعد ایک الگ تصور پیش کیا یعنی روایات کے ساتھ ساتھ متبادل اور کارآمد نظام جمال سے ایک نئی جمالیات کا آغاز۔ جیسا کہ ذکر ہوا کہ غالب کا سفرِ کلکتہ، ان کی زندگی میں ایک نئے اور معنی خیز موڑ کا سبب بنا، وہاں سے لوٹنے کے بعد غالب کا ذہنی سفر اور بھی نمایاں ہونے لگا جس کے بارے میں جمیل جالبی اس طرح رقم طراز ہیں:

> ‘‘غالبؔ کا واسطہ انگریزوں کے ساتھ بچپن سے رہا تھا اور چونکہ وہ آزاد و غیر متعصب تھے، اس لیے جب کلکتہ گئے تو وہاں ‘‘خوبان کشور لندن’’ بھی دیکھیں اور ’بادہ ہائے ناب‘ کا مزہ بھی چکھا۔ کلکتہ میں جدید دور کا آغاز ہو چکا تھا اور یہاں کا ماحول دلی کے ماحول سے مختلف تھا۔ غالبؔ کے ذہن پر ان خیالات نے گہرا اثر ڈالا۔ مغلیہ

سلطنت کا تماشا ان کے سامنے تھا، یہ سب چیزیں ان کے مزاج کا ایک حصہ تھیں۔“

(عبدالحکیم خلیفہ، افکارِ غالب، مکتبہ معین الادب، اردو بازار، لاہور، ۱۹۵۴ء، ص ص ۱۴، ۱۵۔)

غالبؔ کلکتہ میں مغرب سے آئے ہوئے نئے نظام سے متاثر ہوئے، جب کلکتہ کی صنعتی ترقی وتہذیبی زندگی ان کے مشاہدے میں آئی تو زندگی اور فکر وفن کے باب میں اُن کے ذہن کے دروا ہوئے۔ وہ کلکتہ کی نئی تہذیبی زندگی سے بدگمان نہیں ہوئے بلکہ انہیں اس تہذیبی زندگی میں خوبیاں نظر آئی۔

غالب کے تخلیقی ذہن میں ان گنت تجربات کی دنیا آباد تھی ان کے فکر ونظر میں ایسی کشادگی موجود تھی جو دوسرے شعرا کے یہاں عنقا ہے۔ غالبؔ کے کلام میں مشکل پسندی اور دقت آمیزی کے باوجود ان کے اشعار زندگی کے ہر موڑ پر زخموں کا مداوا کرتے ہیں اور مسرت وانبساط کی دولت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کو یہ امتیاز وانفراد بھی حاصل ہے کہ ان کے اشعار انسان کے داخلی جذبے اور فکر کو تحریک بخشتی ہے جس سے قاری کو آسودگی کے ساتھ ساتھ بصیرت اور وژن کی دولت بھی عطا ہوتی ہے۔ غالبؔ کی آفاقی شخصیت ہندوستان کی لازوال تہذیبی میراث ہے اور ان کا کلام ہندوستان کے تہذیبی ورثے میں جواہر پارے کا درجہ رکھتا ہے۔ غالب کی غزلیہ شاعری میں متنوع عناصر موجود ہیں جن عناصر کی بدولت قارئین کی حسیات پر ایک خاص تاثر قائم ہوتا ہے:

18.5: نمونہ امتحانی سوالات

سوال نمبر ۱: غالب اور ان کے معاصرین پر پیش رو شعراء کے کلام پر کون سے اثرات مرتب ہوئے؟

سوال نمبر ۲: میر اور سودا کی شاعرانہ عظمت کو اجاگر کیجیے؟

سوال نمبر ۳: عہدِ غالب کو اردو شاعری کا عہدِ زریں کیوں کہا جاتا ہے؟

سوال نمبر ۴: دبستان دہلی اور دبستان لکھنو کے شعری امتیازات پر روشنی ڈالیے؟

سوال نمبر ۵: عہدِ غالب کے شعری منظرنامے پر مفصل نوٹ لکھئے؟

سوال نمبر ۶: غالب کے اہم معاصرین شاہ نصیر، ذوق، مومن اور ظفر کے مقام کا تعین کیجیے؟

سوال نمبر ۷: اردو شاعری میں غالب کا کیا مقام ہے؟ مدلل لکھئے۔

سوال نمبر ۸: عہدِ غالب کی سیاسی زندگی کا خلاصہ بیان کیجئے؟

سوال نمبر ۹: عہدِ غالب کے شعری منظرنامے پر دبستان دہلی اور دبستان لکھنو کے اثرات کو واضح کیجئے؟

18.5: خلاصہ

اٹھارویں اور انیسوی صدی کا زمانہ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک طرف مغلوں

کی سیاسی وحدت کا چراغ ماند پڑ رہا تھا تو دوسری جانب انگریز بے محابا جبر وتشدد، ظلم وناانصافی اور انتشار روا رکھنے کی ایک بھیانک تاریخ رقم کر رہے تھے۔ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی صورت حال اتنی ناگفتہ بہہ تھی کہ مغل بادشاہوں کا سیاسی انتداب، جاہ و جلال نیز فنکاروں اور دانشوروں کی عظمت وسطوت پر بھی اندیشہ زوال سایہ فگن ہو چکا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات، انگریزوں کا تسلط اور بہادر شاہ ظفر کا رنگون جلاوطنی، یہ واقعات، ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں نراج اور انتشار کے سنگ ہائے میل ہیں۔ بقول احتشام حسین ''غالب کا دور تاریخ ہند میں ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتا ہے جس کے پیچ وخم کا سمجھنا آسان نہیں۔''

ولی سے لے کر عہدِ میر تک دہلی کی شاعری کا روایتی رنگ وآہنگ کسی حد تک مشترک ہے۔ نظیر اکبرآبادی نے تخلیقی سطح پر انفرادی راہ اختیار کرتے ہوئے ہندوستان کی مقامی بولیوں اور ان میں موجود عام بول چال کے لفظوں کو تخلیقی پیرہن بخشا۔ نظیر کے اس تخلیقی روئے کا اپنا حسن ہے۔ اس اکائی میں طلبہ کے لیے دبستان دہلی اور دبستان لکھنو کی شاعرانہ خصوصیات اور امتیازات پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غالب اور ان کے معاصرین میں شاہ نصیر، ذوق، مومن اور بہادر شاہ ظفر کی شاعرانہ خوبیوں کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے، جس سے عہدِ غالب کے شعری منظر نامے کا خدوخال سامنے آجاتا ہے۔ طلبہ کی آسانی کے لیے اکائی کے اختتام پر مشکل اور دقیق الفاظ کے معنی فرہنگ کی صورت میں موجود ہے اور سفارش کردہ کتب کی فہرست بھی دی گئی ہے تاکہ طلبہ مزید اس موضوع سے متعلق جانکاری حاصل کر سکیں۔

18.6: فرہنگ:

منظر نامہ: صورت، صورت حال

ثقیل: بھاری بوجھل

اسالیب: طور طریقے، اطوار

عبوری: ہنگامی، عارضی

اختصاص: خاص امتیاز، برتری

باریاب: حاضر، داخل

مجازاً: کامیاب

نشیب وفراز: بلندی وپستی، اونچ نیچ

عریض: بڑا، چوڑا

تغیر: تبدیلی

منقسم: بانٹا ہوا، تقسیم کیا گیا

ڈھلان: ناہموار، ڈھالو

فراق: جدائی، فرقت

معدودے: قلیل تعداد میں، چند

مقصود: مراد، غرض

پیش رو: آگے چلنے والا، قائد جس کی پیروی کی جائے

آشوب: فتنہ فساد، پریشانی

پیچ وخم: موڑ، کجی، چکر

تعین: معین کرنا، مخصوص کرنا

مدلل: دلیل سے ثابت کرنا

چشمک: چھیڑ چھاڑ۔ نوک جھونک

ہجر: فراق، جدائی

آسودگی: راحت، آرام، سکون

نشاط: خوشی، شادمانی

ابہام: مبہم، جو واضح نہ ہو

اجمالی: مختصر، کم

تصوف: قلندری، راہ طریقت، وہ مسلک جس کے وسیلے سے صفائی قلب حاصل ہو۔

مشتاق: آرزومند، طالب ہونا

عشرت: عیش وآرام

18.7: سفارش کردہ کتب

۱۔ یوسف سلیم چشتی: شرح دیوان غالب
۲۔ الطاف حسین حالی: یادگار غالبؔ
۳۔ مجنون گورکھپوری: غالبؔ شخص اور شاعر
۴۔ پون کمار ورما: غالب: شخصیت اور عہدِ
۵۔ شاہد ماہلی: غالب اور عہدِ غالب

۶۔ عبادت بریلوی: غالب اور مطالعہ غالب

۷۔ مالک رام، ذکر غالبؔ

۸۔ قاضی عبدالودود، جہان غالب۔

۹۔ حنیف نقوی: غالب اور جہان غالب

۱۰۔ شمس الرحمٰن فاروقی: تفہیم غالب

۱۱۔ فرمان فتح پوری: اردو شاعری کا فنی ارتقاء

۱۲۔ وزیر آغا: اردو شاعری کا مزاج

۱۳۔ الطاف حسین حالی: مقدمہ شعر و شاعری

۱۴۔ گوپی چند نارنگ، غالب معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات۔

اکائی نمبر۱۹: غالبؔ کے سوانحی کوائف

19.1 اغراض و مقاصد

19.2 تمہید

19.3 غالبؔ کی حالات زندگی

19.4 نمونہ امتحانی سوالات

19.5 خلاصہ

19.6 فرہنگ

19.7 سفارش کردہ کتب

19.1: اغراض و مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ غالبؔ کی حالات زندگی کا مختصر جائزہ لے سکیں گے۔
غالبؔ کے خاندان کے بارے میں واقفیت حاصل کر پائیں گے۔
غالب کے سفر کلکتہ کا مجموعی جائزہ بھی لیں پائیں گے۔

19.2: تمہید

یہ اکائی اردو کے ایک نامور شاعر مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کے حیات کے حوالے سے تحریر کی گئی ہے۔ اس اکائی میں غالبؔ کی زندگی کے متعلق واقفیت پہنچائی جائے گی اور ان کے خاندان کے بارے میں بھی جانکاری دی جائے گی۔ ساتھ میں اس اکائی کا خلاصہ بھی پیش کیا جائے گا اور آخر میں سوالات بھی دئے جائیں گے تاکہ طلباء امتحان کی تیاری کر سکیں اور ہم امید کرتے ہیں کہ طلباء صرف اسی اکائی تک محدود نہیں رہیں گے بلکہ آخر میں دی گئی سفارش کردہ کتابوں کی فہرست سے چند ایک کتابوں کا مطالعہ بھی کرنے کی کوشش کریں گے۔

19.3 غالب کی حالات زندگی:

غالبؔ کے زمانے میں ہندوستان میں تہذیبی اعتبار سے روایت سازی کے بجائے روایت شکنی کا عمل زیادہ پُر زور تھا۔ جو اس عہد کی زندگی کے ہر شعبے سے صاف ظاہر ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ہر طرح کی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو رہی تھیں خواہ وہ

سیاسی، سماجی، تعلیمی یا معاشی تبدیلیاں ہوں۔ مغلوں کے عہد کی داستانیں دم توڑ رہی تھیں یا پھر وہ نیم مُردہ ہو چکی تھیں یا ہو رہی تھیں۔ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا، ویسے ویسے تبدیلیاں تیز ہوتی گئیں۔ غالبؔ کے دور میں سب کی نظروں کے سامنے مغربی نوآبادیاتی نظام کا متبادل تھا۔ اتفاق سے مغربی نوآبادیاتی نظام کے پاس جو حربے تھے، وہ باقی متبادل حربوں کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور، کارگر اور موثر تھے۔ یہ حربے سیاسی بھی تھے، سماجی بھی، فکری بھی اور ثقافتی بھی۔ اب اس عہد میں کیا کیا جائے، جب دو نظام ہائے زندگی کی کشمکش ہو رہی تھی۔ اس طرح ایک عام بے یقینی، حیرت اور تشکیک کا ہونا لازم ہے۔ غالبؔ کا دورِ حیات بے شمار عناصر کی کشمکش کا زمانہ تھا۔ وہ اُس خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جس کے رشتے گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ بھی تھے اور آنے والے وقت کے ساتھ بھی اور جس شہر سے وہ تعلق رکھتے تھے، وہ سیاسی کشمکش کے مرکز بھی تھا۔ کسی بھی معاملے کی شروعات کہیں سے بھی ہو، اُس کا اختتام دلی میں ہی ہوتا تھا۔ چنانچہ غالبؔ جیسے شاعر کے سوانحی حقائق میں اس عہد کے خلفشار کی دلیل اگر مکمل طور سے دکھائی دیتی ہے، تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ یہی اُن کی خوش قسمتی بھی تھی اور بد قسمتی بھی۔ وہ پُرانی روایات کی آغوش میں نہ صرف پلے بڑھے تھے، بلکہ انہیں اس کے ساتھ اس حد تک محبت اور وابستگی تھی کہ تمام عمر خلعت، خطاب، وظیفہ و پنشن (کی تمنا) اور اس پر فخر کے ساتھ جیتے رہے۔ مگر مشاہدات، تجربات و حادثات نے ان کے ذہن کو نئی سمتوں میں بھی سفر کرانا سکھایا تھا۔ اس کی مزید وضاحت نثار احمد فاروقی یوں کرتے ہیں:

> ’’غالبؔ کا عہد یعنی ۱۷۹۷ء سے ۱۸۶۹ء تک پھیلی ہوئی ۷۲ سال کی مدت، جس میں انیسویں صدی کا نصف اول گُم ہو گیا ہے، اپنے سماجی عوامل اور تاریخی اثرات کے اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ میں بہت ہی اہم زمانہ ہے اور ہم صرف ہندوستان ہی نہیں، بلکہ پورے کرۂ ارض پر نظر ڈال کر دیکھیں، تو یہ بڑا فیصلہ کُن عہد نظر آتا ہے، یورپ میں صنعتی انقلاب کی تکمیل ہو رہی ہے، انسانیت تاریخ کے دوراہے پر کھڑی ہے، جہاں تقلید اور اجتہاد، عقلیت اور عقیدہ، روایت اور تجدد یا مختصراً کہئے تو قدیم اور جدید کے درمیان ایسا نمایاں فرق اور اتنا شعور انگریز معاوضہ نظر آتا ہے، جو انسانی تہذیب کی چند ہزار سالہ تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتا، یہ وہ دور ہے، جس میں تجدید کو انسانی تہذیب کا تکملہ نہیں، بلکہ روایت کے خلاف ایک صف آرائی سمجھا گیا ہے۔‘‘
>
> (تلاش غالب، ص ۳۴۰۔)

مذکورہ اقتباس کو زیرِ نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ کا عہد ایک طرح کی کشمکش کا عہد تھا۔ اُس عہد کو موصوف نے پوری دنیا میں اس وقت کا ایک فیصلہ کُن عہد قرار دیا ہے۔ ہندوستان کی تہذیب و تاریخ مکمل طور پر دوراہے پر

کھڑی تھی یا تو ایک انسان کو تقلید کا فیصلہ کرنا تھا یا پھر تجدید کا اور ایک انسان کو یہ بھی ذہن میں رکھنا تھا کہ تمام دنیا بدل رہی ہے۔ یورپ تو پہلے ہی بدل چکا تھا اور باقی دنیا تبدیلی کی طرف جا رہی تھی۔ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز نے اشتراکیت کے نئے نظریے دینے شروع کئے تھے جسے تقریباً نصف دنیا قبول کرنے جا رہی تھی، اسی زمانے میں جرمنی کا ایک اور مفکر گوئٹے اپنی ''فاوسٹ'' لکھ رہا تھا۔ جس میں نظریہ خیر وشر کی ایک نئی تعبیر کی جا رہی تھی اور اسی زمانے میں سگمنڈ فرائڈ بھی انسانی نفسیات کے تہہ خانوں میں اتر رہا تھا۔ جس نے انسان کے شعور پر پہلی بار کئی سوالات اُٹھائے اور اسی زمانے میں مسلمانوں کی تاریخ میں بھی کچھ روشن خیال، تجدد پسند انقلابی بھی جنم لے رہے تھے۔ حالانکہ وہ کوئی تنظیم نہ بنا سکے۔ جمال الدین افغانی نے اسلام میں تحریک تجدد کی بنیاد ڈالی، اس کی دعوت وحدت اسلام کی طرف تھی۔ اسی زمانے میں عرب میں شیخ عبدالوہاب نجدی کی تحریک احیا(islamic fundamentalism) سامنے آ رہی تھی۔

مختصراً جس زمانے میں غالبؔ جی رہے تھے، وہ زمانہ میں تبدیلیوں کا زمانہ تھا اور یہ تبدیلیاں ہمہ گیر تھیں۔ اُنہوں نے ہر مکتب فکر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ فلسفہ، سماجیات، اقتصادیات، ادبیات، عمرانیات، مذہب غرض کہ ہر مکتب فکر میں اجتہاد کی ضرورت تھی اور ہر مکتب فکر کے لئے عظیم مفکر پیدا ہو چکے تھے۔ اس طرح انیسویں صدی ایک نئی صدی تھی ہی مگر وہ پچھلی تمام صدیوں سے بالکل مختلف بھی تھی۔ اسی صدی میں ہندوستان میں کچھ مفکر اور روشن خیال بھی پیدا ہو چکے تھے۔ جن میں راجہ رام موہن رائے اور سر سید احمد خان بڑے نام ہیں، جنہوں نے اپنے اپنے مذاہب سے وابستہ افراد کو نئی صدی سے آنے والی تازہ ہوا سے مستفید ہونے کا درس دیا۔ غالبؔ نے بھی یہ محسوس کیا اور چونکہ وہ ایک جدید ذہن رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے نہ صرف جدت کو محسوس کیا، بلکہ اُس سے مستفید ہونے کی بھی لوگوں کو تلقین کی ہے۔ محمد حسن لکھتے ہیں:

> ''غالب کے دور تک آتے آتے ایک طرف تو یورپ عہد ظلمت سے نکل کر روشن خیالی کے دور میں داخل ہو چکا تھا، تو دوسری طرف ایشیاء سے اس کے تجارتی تعلق کی اجارہ داری ہندوستان سے ہی نہیں، ترک ایرانیوں کے ہاتھ سے بھی نکل چکی تھی، جو ہند ایران تہذیب کی بنیاد تھی۔ اب ان اہلِ حرفہ کی اہمیت نہ تھی جو ڈھاکے کی ململ بُنتے اور بیرون ملک برآمد کرتے تھے۔ اب انسان اپنے ہاتھ میں 'عقل اور ارتقاء' کے نئے ہتھیاروں کے ذریعے لامحدود امکانات کو ختم کرنے کے خواب دیکھنے لگا۔''

(حسن محمد، غالب اور عہدِ غالب، غالب نامہ، جولائی ۱۹۸۱ء، ص ۱۳۳۔)

جیسا کہ ہم نے رقم کیا کہ اردو زبان کے ممتاز و قد آور شاعر مرزا اسداللہ خان غالبؔ نے اس دور میں آنکھیں کھولی

جب ہندوستان میں تہذیبی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی قدروں میں انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ ہندوستان کے سیاسی اور سماجی منظر نامے پر غیر معمولی تقلیب کے آثار نظر آرہے تھے۔ مغلیہ سلطنت کا سورج ٹمٹما رہا تھا اور جاگیردارانہ نظام اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ دوسری طرف ہندوستان کی سیاسی قیادت کی باگ دوڑ انگریزی سامراج اپنے آہنی پنجوں میں جکڑ رہے تھے۔ انگریزی سامراج نے ہندوستان کے سیاسی خدوخال پر اپنے مکروسائے پھیلا دئے تھے۔ ایک تہذیب پر عالم نزع کی کیفیت طاری ہو چکی تھی اور دوسری تہذیب کی رگوں میں زندگی کا خون تازہ دم تھا۔ ایسے تغیر پذیر ماحول میں غالب کی تخلیقی شخصیت کا خمیر تیار ہوا۔ غالب کی تحریروں میں تہذیبی انارکی کا ارتسام صاف جھلکتا ہے۔ انتشار واضطراب کے اس دور میں ادبی اور علمی منابع سوکھ چکے تھے۔ سیاسی نظام یقیناً پژمردہ ہو چکا تھا۔ اس بدنظمی کے دور میں ہندوستان کے تہذیبی افق پر ایک ایسا کوکب درخشاں نمودار ہوا، جس سے اقلیم سخن کا بادشاہ مرزا اسداللہ خان غالب کے نام سے جانا جاتا ہے۔

مرزا کا نام اسداللہ خان اور مرزا نوشہ، تخلص اسد سے ہوتا ہوا غالبؔ، شاہی لقب نجم الدولہ و دبیر الملک نظام جنگ تھا۔ غالب کے تخلص کے حوالے سے محمد حسین آزاد اپنی شہرۂ آفاق تذکرہ ''آب حیات'' میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''نام اسداللہ خاں تھا پہلے اسدؔ تخلص کرتے تھے۔ جھجر میں کوئی فرومایہ سا شخص اسدؔ تخلص کرتا تھا۔ ایک دن اس کا مقطع کسی نے پڑھا۔
>
> اسدؔ تم نے بنائی یہ غزل خوب
> ارے او شیر رحمت ہے خدا کی
>
> سنتے ہی اس تخلص سے جی بیزار ہو گیا، کیونکہ ان کا ایک یہ بھی قاعدہ تھا کہ عوام الناس کے ساتھ مشترک حال ہونے کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ۱۲۴۵ھ و ۱۸۲۸ء میں اسداللہ غالب کی رعایت سے غالبؔ تخلص اختیار کیا، لیکن جن غزلوں میں اسد تخلص تھا۔ انہیں اسی طرح رہنے دیا۔''

(مولانا محمد حسین آزاد، آب حیات، کتابی دنیا دہلی، ص، ۴۳۲)

تخلص کے حوالے سے یہ قصہ بھی مشہور ہے کہ کسی نے میر امانی اسد کے شعر کو تخلص کی بنیاد پر غالب کا شعر سمجھ کر اس شعر سے بہت خوش اور غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا جناب مجھے آپ کا یہ شعر بہت پسند آیا، تو انہوں نے کہا کہ کون سا شعر آپ کو پسند ذرا شعر پڑھیں، تو انہوں نے غالب کو میر امانی اسد کا یہ شعر سنایا:

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

یہ شعر سنتے ہی غالب کو بہت غصہ آیا اور انہوں نے جواب میں کہا کہ ”حضرت اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اس پر رحمت خدا کی اور اگر یہ مجھ اسد کا شعر ہے تو مجھ پر لعنت خدا کی“ اور اتنے دلبرداشتہ ہوئے کہ اسد نامی تخلص کو ہی خیر باد کہا اور اپنا تخلص غالب رکھا۔

اسد اللہ خان کی پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۲ء بمطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو بدھ کی رات آگرہ میں ہوئی (یادگار غالب، حالی، ص ۱۵)۔ جہاں تک غالب کے آباؤ اجداد کا تعلق ہے وہ نہ تو دلی کے رہنے والے تھے اور نہ ہی موروثی اعتبار سے آگرہ کے رہنے والے تھے۔ مرزا غالب کے پردادا کا اسم گرامی مرزا قوقان بیگ تھا۔ جن کی پشتینی وابستگی ترک قوم سے تھی اور ان کا نسبی انضمام توران ابن فریدوں تک پہنچتا ہے۔ جب تورانیوں کا جاہ وجلال کیانیوں کے عروج واقبال کی آندھی میں غبار کی طرح اڑ گیا تو حکمران خاندان کے باقی ماندہ افراد اپنے وطن کو چھوڑ کر منتشر ہوگئے۔ تاریخ نے پھر کروٹ بدلی اور اسلامی عہد میں اس خاندان نے اپنی منظّم کوششوں سے ایک مہتمم بالشان سلطنت کی داغ بیل ڈالی جسے تاریخ میں سلجوقی سلطنت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس عظیم الشان سلطنت کے سورج کو بھی جب گرہن لگا تو سلطنت سے منسلک افراد مخلوق الحالی اور پسماندگی کا شکار ہوگئے۔ ان ہی میں ایک کا نام شہزادہ ترسم خان تھا جو سمرقند میں جا بسا۔ غالبؔ اسی ترسم خان کی اولاد میں سے تھے۔

غالبؔ کے پردادا مرزا قوقان بیگ پہلے لاہور میں نواب معین الملک بہادر کی ملازمت میں داخل ہوئے پھر معین الملک کی وفات پر لاہور سے دہلی پہنچے اور نواب ذوالفقار الدولہ میر نجف خان بہادر کے نظام حکومت سے وابستہ ہوگئے۔ لیکن جلد ہی یہاں سے مستعفی ہونے کے بعد انہوں نے مہاراجہ جے پور کے یہاں خدمات انجام دی اور آگرہ کو اپنا مسکن بنایا۔ قوقان بیگ کی شادی ۱۷۶۳ء میں ہوئی اور ان کی اولاد میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہے جن میں صرف ان کے دو صاحبزادوں کا نام محفوظ ہے۔ مرزا عبداللہ بیگ خان اور مرزا نصراللہ بیگ خان۔ مرزا عبداللہ بیگ خان غالبؔ کے والد بزرگوار ہیں اور ان کی ولادت دہلی میں ہوئی۔

غالبؔ کی والدہ عزت النساء بیگم میرٹھ سرکار کے ایک فوجی افسر خواجہ غلام حسین کمیدان کی دختر نیک اختر تھی۔ جن کی شادی ۱۷۶۵ء کو مرزا عبداللہ بیگ خان سے ہوئی۔ انہیں کو دنیائے شاعری کے نابغہ روزگار شاعر مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کے والدین کا طغرائے امتیاز حاصل ہوا۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ مرزا غالبؔ کے والد راجہ بختاور سنگھ کی طرف داری میں لڑتے ہوئے گولی کا نشانہ بنے تھے اور راج گڑھ کے مقام پر ایک باغی زمیندار سے لڑتے لڑتے زخموں کی تاب نہ لاکر انتقال کر گئے اور وہی تدفین عمل میں آئی۔ اس وقت غالبؔ کی عمر محض پانچ سال کی تھی۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی شرح دیوان غالبؔ میں یوں رقم طراز ہیں:

> ”غالبؔ کا اصلی نام مرزا اسداللہ بیگ خان تھا۔ مرزا نوشہ عرف تھا اور ”نجم الدولہ و دبیر الملک اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ“ خطاب تھا باپ کا نام مرزا عبیداللہ بیگ تھا جن کی شادی آگرہ میں مرزا غلام حسین خاں کی بیٹی عزت النساء بیگم سے ہوئی تھی۔ ان ہی کے بطن سے غالبؔ پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت ۲۷/دسمبر ۱۷۹۷ء ہے۔“

(پروفیسر یوسف سلیم چشتی، شرح دیوان غالب، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، نئی دہلی، ص، ۲۴)

غالبؔ کی پرورش کی تمام تر ذمہ داری والد کے انتقال کے بعد چچا مرزا نصراللہ خان بیگ نے انجام دی، لیکن مرزا غالبؔ کی سیاہ بختی کہ یہ سایہ بھی زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکا۔ مرزا نصراللہ بیگ ۱۸۰۶ء میں ایک معرکہ کے دوران ہاتھی سے گر کر شدید زخمی ہوئے اور یہی ان کے سانحہ ارتحال کا موجب بنا۔ چونکہ اس بات کے تاریخی شواہد موجود نہیں کہ مرزا نصراللہ بیگ کی وفات ۱۸۰۶ء کے کس ماہ میں میں ہوئی اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت غالبؔ کی عمر محض آٹھ سے نو برس کی تھی غالبؔ نے دوستوں کے نام خطوط میں اس صدمہ عظیم کو اپنے اور اپنے بھائی کے لیے دوبارہ یتیمی کے مترادف قرار دیا ہے۔ مرزا غالب کے ننھیال مالی اعتبار سے آسودہ اور خوش حال تھے لہٰذا انہوں نے غالب کی پرورش بڑے ناز و نعم سے انجام دی۔ انہوں نے غالبؔ کی ابتدائی اور مروجہ تعلیم پر خاطر خواہ توجہ مبذول کی۔ غالبؔ نے آگرے میں مولوی محمد اعظم سے تعلیم حاصل کی۔ غالبؔ نے فارسی زبان و ادب کے اسرار و غوامض ملا عبدالصمد سے حاصل کئے (یادگار غالب، حالی، ص ۲۰) جس کا ثبوت غالبؔ کی تصانیف ”لطائف غیبی“ اور ”درفش کاویانی“ سے ملتا ہے کہ ملا عبدالصمد سے شرف تلمذ کے وقت غالب کی عمر چودہ برس کی تھی یوں ابتدائی زمانے میں ہی فارسی شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق پیدا کر لیا۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی اس حوالے سے اپنی کتاب شرح دیوان غالبؔ میں یوں لکھتے ہیں:

> ”غالبؔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے اس لیے ان کی پرورش ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں نے کی لیکن جب وہ آٹھ سال کے ہوئے تو چچا بھی فوت ہو گئے۔ مگر نواب احمد بخش بیگ نے مرزا کے خاندان کے لیے انگریزوں سے وظیفہ مقرر کرا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ساری عمر ان کے ثناء خوان رہے۔
>
> مرزا نے ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور عالم مولوی محمد معظم صاحب سے حاصل کی لیکن ان کی خوش قسمتی سے ۱۸۱۱ء میں جب ان کی عمر ۱۴ سال کی تھی ملا عبدالصمد نامی ایک ایرانی عالم جو نومسلم تھا سلسلہ سیر و سیاحت سے وارد آگرہ ہوا انھوں نے دو سال تک اس سے تعلیم حاصل کی۔“

(پروفیسر یوسف سلیم چشتی، شرح دیوان غالب، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، نئی دہلی، ص، ۲۵۔۲۴)

۹ اگست ۱۸۱۰ء کو مرزا غالبؔ کی شادی نواب احمد بخش خان بہادر والی لوہارو کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خان کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ غالبؔ کی حیات کا یہ وہ زمانہ ہے جب عیش وعشرت اور فارغ البالی کے ایام چل رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ان کی شخصیت میں اس نازونعم نے ایسی عادتیں اور بے اعتدالیاں پیدا کیں کہ ان کی شخصیت میں فطرت ثانیہ کا درجہ اختیار کرگئیں۔ امتداد زمانہ کے ساتھ کچھ عادتوں سے چھٹکارا حاصل تو ہوا لیکن بعض تادم زیست غالبؔ کی عسرت اور معاشی ہبوط کا محرک بن گئیں۔ حالانکہ دہلی آتے جاتے تھے لیکن ۱۸۱۲ء میں غالبؔ نے آگرہ کی سکونت ترک کرکے مکمل طور دہلی میں قیام کیا۔ اس حوالے سے یوسف چشتی لکھتے ہیں:

> ''۱۸۱۰ء میں جب کہ ان کی عمر ۱۳ سال کی تھی، ان کی شادی نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوگئی اور ۱۸۱۲ء میں انھوں نے اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ کر دہلی میں سکونت اختیار کرلی۔''

(پروفیسر یوسف سلیم چشتی، شرح دیوان غالب، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، نئی دہلی، ص، ۲۵)

دہلی کے ادبی اور علمی ماحول میں غالبؔ کی تخلیقی حذاقت کو مہمیز عطا ہوئی۔ دہلی کو اس وقت یہ امتیاز حاصل تھا کہ مغلیہ حکومت کا دارالسلطنت ہونے کے باعث آگرے کی بہ نسبت تعلیمی، ادبی اور کچھ حد تک اقتصادی وسائل کی فراوانی بھی تھی اور غالبؔ نے اس ماحول میں اپنے خوابوں کی تعبیر تلاش کی لیکن یہاں آکر نئی زندگی کے نئے تقاضوں نے مسائل کی جو زنجیر غالبؔ کے لئے تیار کی اس سے انہیں زندگی بھر رہائی نہ مل سکی۔ سنجیدگی، متانت اور شخصیت سازی کی آرزو ان کی حیات کا نقطہ ارتقاز قرار پایا اور وہ علمی، فکری اور ادبی مناصب میں رفعت اور سطوت کے زینے طے کرتے گئے البتہ وقت کے ساتھ ساتھ غالبؔ کی شخصیت کو معاشی الجھنوں نے مقید کرکے رکھ دیا اور آگرے کی عیش وعشرت سے بھرپور حیات ان کے لیے خواب بن کر رہ گئی۔ غالبؔ جب تک آگرے میں مقیم رہے انہیں اپنی معاشی واماندگی کا زیادہ احساس نہیں ہوا۔ مالک رام کے بقول ''انہیں خرچ کی کوئی تنگی نہ تھی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ روپے پیسے کی افراط تھی۔'' غالبؔ کو دہلی کے ابتدائی ایام میں معاشی اعتبار سے زیادہ صعوبتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ساڑھے سات سو روپے سالانہ پنشن نواب احمد بخش خان کی وساطت سے ملتی تھی لیکن آہستہ آہستہ غالبؔ کے اخراجات اور آمدنی میں توازن بگڑنے لگا اور غم روزگار کا حصار ان کے گرد تنگ ہوتا گیا۔ غالبؔ کے والد مرزا نصراللہ بیگ کی وفات کے بعد جس جاگیر سے ان کو حصہ ملتا تھا وہ جاگیریں بھی نواب احمد بخش خان کے حصہ میں شامل ہوگئیں۔ نواب احمد بخش خان نے اپنی جاگیروں کو اولادوں میں منقسم تو کیا لیکن غالب کا حصہ نواب شمس الدین خان فیروزپور

کے اختیار میں چلا گیا، جس کی غالبؔ کے ساتھ مخاصمت تھی اور انہیں قوی یقین تھا کہ وہ اس کی ادائیگی میں مسائل پیدا کر دیں گے اور ایسا ہی معاملہ ہوا غالبؔ نے بالآخر مقدمہ دائر کرنے کے لئے کلکتہ کا قصد کیا۔ یہ ایک طرح سے غالبؔ کے لیے جد و جہد حیات کا مرحلہ تھا۔ اس حوالے سے خلیق انجم اپنی کتاب ''غالبؔ کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''غالبؔ کی پنشن کا قضیہ ۱۸۰۶ء میں اس وقت شروع ہوا تھا، جب غالبؔ ابھی نو سال کے تھے۔ اس وقت ان کے والد اور چچا کا چھوڑا ہوا اثاثہ اتنا تھا کہ ان کی اور اہل خاندان کی زندگی عیش و آرام سے گزر رہی تھی اور پھر چوں کہ خاندان میں غالبؔ اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف بیگ کے علاوہ اور کوئی مرد نہیں تھا اور یہ دونوں کم عمر تھے، اس لیے پنشن کے سلسلے میں نواب احمد بخش خاں نے ان کے ساتھ جو ناانصافی کی تھی، اس کا انھیں پتا بھی نہیں چلا لیکن جب وہ سن بلوغت کو پہنچے تو انھیں اس ناانصافی کا پتا ہوا۔ غالبؔ نے بارہا نواب احمد بخش خان کی توجہ اس ناانصافی کی طرف مبذول کرا کے اپنا جائز حق مانگا لیکن نواب احمد بخش خاں نے غالبؔ کے مطالبات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ مجبور ہو کر ۱۸۲۸ء کو غالبؔ نے ایک عرض داشت کے ذریعے کلکتے میں حکومت کی توجہ اس ناانصافی کی طرف مبذول کرائی۔ خط کے متن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت کے نام پنشن کے سلسلے میں غالبؔ کی یہ پہلی عرض داشت تھی۔''
>
> (خلیق انجم، غالبؔ کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، غالب انسٹیٹیوٹ نئی دہلی، ص، ۸۵)

۱۸۲۸ء کو غالب کلکتہ پہنچے۔ انہوں نے اس سفر کے دوران لکھنؤ اور بنارس میں بھی قیام کیا یہ سفر غالبؔ کی تخلیقی شخصیت کے اعتبار سے اہم ہے کیونکہ اس سفر نے راست طور پر غالبؔ کے افتاد طبع اور شاعری پر دور رس اثرات مرتسم کئے۔ دیار کلکتہ کا سفر غالبؔ نے جس مقصد کے لیے کیا تھا اس میں خاطر خواہ کامیابی تو حاصل نہ ہو سکی البتہ یہاں کی ادبی اور ثقافتی منظر نامے کی بوقلمونی نے غالبؔ کے تخلیقی وژن کو متاثر کیا۔ محققین کے مطابق ''کلکتہ میں لوگوں نے مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کی کافی خاطر مدارت کی اور ان کو کامیابی کی امید بھی دلائی۔''

قیام کلکتہ کے دوران کئی لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کیا۔ غالبؔ کی شخصیت میں خودی اور اعتماد کا قوام اس قدر موجود تھا کہ وہ ہندوستان میں امیر خسرو کے علاوہ کسی کو بھی لائق اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں حالی نے ''یادگارِ غالبؔ'' میں ان کا ایک خط نقل کیا ہے ''اہل ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم ثبوت نہیں میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔'' مرزا نے ایک مثنوی میں باد مخالفت کے عنوان سے تخلیق کی ہے جس میں انہوں نے قیام کلکتہ کے دوران معترضین کے

اعتراضات اور اپنے جوابات کے علاوہ اپنی غریب الدّیاری کا نہایت فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ غالبؔ کلکتہ میں مغرب سے آئے ہوئے، نئے نظام سے متاثر ہوئے تھے۔ جب کلکتہ کی صنعتی ترقی وتہذیبی زندگی ان کے مشاہدے میں آئی تو زندگی اور فکر وفن کے باب میں اُن کے ذہن کے دروازے کچھ اور کُھل گئے۔ وہ کلکتہ کی نئی تہذیبی زندگی سے بدگمان نہیں ہوئے، بلکہ انہیں یہ تہذیبی زندگی پسند آئی۔ حمید احمد خان غالبؔ کے شعر کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں:

’’خوشا روز و شب کلکتہ وعیش مقیمانش
گورنر مہر ومکناتن بہادر ماہ تابانش

اس معروف ومدحیہ مطلع میں بھی کلکتے کی ستائش کا وہ جذبہ چھلکتا ہے، جو اُس شہر کی جدت طراز زندگی میں ایک خاص صفائی اور قرینہ دیکھ کر غالبؔ کے دل میں خود بخود پیدا ہوا۔ کلکتے سے لکھے ہوئے ایک فارسی خط میں ایک مختصر سی عبارت ملتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بندرگاہ کی بین الاقوامی چہل پہل، بازاروں کی رونق اور کلکتے کے مغربی شہر سازوں کی ہنرمندی کا مرزا غالبؔ کی طبعیت پر کیا اثر ہوا۔‘‘

(نئی تنقید، (مرتب، خاور جمیل)، ص ۲۱۷۔)

جس فارسی خط کا ذکر موصوف نے کیا، اُسی خط کو موصوف نے اپنے اصل متن کے ساتھ کچھ یوں پیش کیا ہے:

’’چہ کلکتہ جہانے از ہرگونہ کالا مالا مال، جز چارہ مرگ ہر چہ گوئی پیش ہُنر وارنش سہل، و جز بخت ہر چہ خواہی بہ بازارش ارزاں۔‘‘

(سورج، لاہور، دوصد سالہ جشن غالبؔ، مدیر (تسلیم احمد تصور)، ص ص ۱۳۶، ۱۳۷۔)

کلکتہ کی نئی رونق سے غالب اس قدر متاثر تھے کہ واپس آ کر سراج الدین احمد کو ایک فارسی خط میں یوں لکھتے ہیں اور جس کا مفہوم کچھ اس طرح کا ہے:

’’اگر میں عنفوانِ شباب میں وہاں گیا ہوتا اور شادی خانہ داری کی ذمہ دارایاں میری راہ میں حائل نہ ہوتیں تو موت العمر کے لئے کلکتے میں ہی رہ جاتا۔‘‘

(سورج، لاہور، دوصد سالہ جشن غالبؔ، مدیر (تسلیم احمد تصور)، ص ص ۱۳۶، ۱۳۷۔)

غالبؔ جیسا ایک ذہین انسان موت کی آرزو کس انداز میں کرتا ہے اور مرنے کے لئے کس جگہ کا تعین کرتا ہے۔ مرنے کے لئے کسی جگہ کا انتخاب کرنا حقیقتاً اُس جگہ کی ایک الگ ہی مناسبت ہوگی۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ تھی وہ یہ کہ کلکتہ ایک جدید شہر بن گیا تھا اور غالبؔ نئے کلکتہ سے متاثر ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کلکتہ کا ذکر غالبؔ نے نہایت حسین اور دلکش پیرائے میں کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

کلکتے کا جو ذکر کیا، تو نے ہم نشین
اک تیر میرے سینے میں، مارا کہ ہائے ہائے

غالبؔ انگریزوں کے لائے ہوئے ڈاک کے نظام سے بے حد متاثر تھے۔ غالبؔ کے زمانے میں دو طرح کے نظامِ ڈاک کام کرتے تھے۔ ایک ''ہندوستانی ڈاک'' دوسرا ''انگریزی ڈاک''، ہندوستانی ڈاک مقامی لوگ چلاتے تھے، اُس کو چلانے کے لئے ٹھیکہ دار کام کرتے تھے۔ اس کے بجائے، انگریزی نظامِ ڈاک، مکمل طور پر انگریزوں کے ماتحت تھا، ملازم مقامی لوگ ہی تھے۔ مگر انگریزوں کے تحت ہونے کی وجہ سے، یہ نظام ڈاک زیادہ موثر اور مکمل تھا۔ اس نظام ڈاک کی یہ خصوصیت ہوتی تھی، نہ ہی خط ضائع ہوتا تھا اور نہ ہی خطوط کے پہنچنے میں زیادہ وقت صرف ہوتا تھا۔ غالبؔ کو کلکتے کے سفر کے دوران انگریزی ڈاک کی خوبیوں کا بار بار تجربہ ہوا، یہی وجہ ہے، وہ عموماً اپنے خطوط میں انگریزی ڈاک سے مستفید ہونے کی کہہ رہے تھے اور ہندوستانی نظام ڈاک کی خرابیوں اور بُرائیوں کی طرف دھیان دلاتے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوستانی نظام ڈاک، سُست رفتاری اور پُرانے طریقوں پر رائج تھا۔ اس کے بجائے، انگریزی نظام ڈاک، نئے نئے طریقوں اور نئے طرزِ عمل کے تحت کام کر رہا تھا۔ ڈاک کی ان خوبیوں کا ذکر وہ اپنے فارسی خطوط میں اکثر و بیشتر کچھ یوں کرتے ہیں:

''نامہ عجالتہ در ڈاک انگریزی روان سازند۔۔۔۔۔۔ باشد کہ قاصدان ڈاک انگریزی تیر دعائے مستجاب مہدف غلط نہ کنند۔''

(ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ہم عصر سماجی و تہذیبی مسائل کا ادراک اور غالب، انتخاب مقالات غالب نامہ: (تنقیدات)، مرتب پروفیسر نذیر احمد، ص ۳۹۵۔)

ایک جگہ انگریزی ڈاک بارے میں یوں ذکر کیا ہے:

''دریں ڈاک نامہ تلف نمی شدد۔''

(نامہ ہائے فارسی غالب، مرتب (سید اکبر علی ترمذی)، ص ۲۵۔)

ایک اور جگہ، اس طرح کے کلمات دہراتے ہیں:

''خط از ڈاک انگریزی تلف نمی شود۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پا بر جا باش کہ باکے نیست۔''

(نامہ ہائے فارسی غالب، مرتب: سید اکبر علی ترمذی، ص ۴۵۔)

ایک اور جگہ ہندوستانی ڈاک کی نااستواری کا ذکر اور آئندہ کیلئے لائحہ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہر دو بار نامہ در ڈاک ہندوستانی فرستادستم وایں سر رشتہ را آں مایہ استواری نیست کہ دل بداں تواں بست۔

لا جرم در رسیدن آں عرائض دو دل بودم۔ اکنوں ۔۔۔۔۔۔ عہد کردم کہ ازیں بعد نامہ جز در ڈاک انگریزی نفرستم۔''

(پنج آہنگ (عکسی)، مرتب: کالی داس گپتا رضا، ص ۱۱۳۔)

ان معنوں میں ہم یہ جان گئے ہیں کہ وہ ہندوستانی ڈاک کی نااہلی اور لاپروائیوں سے تنگ آ چکے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستانی ڈاک کی کُھل کر مخالفت کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے اکثر خطوط ہندوستانی ڈاک کے ذریعے ضائع ہو چکے تھے اور دوسرا یہ کہ اگر اس کے ذریعے خط مکتوب الیہ تک پہنچتا بھی، تو بڑی دیر کے بعد، اس کے بجائے انگریزی ڈاک موثر اور کارآمد اور ایک جدید ڈاک سروس تھی۔ یہ نظامِ ڈاک، خطوط کو ضائع ہونے نہیں دیتی اور جلدی سے مکتوب الیہ تک خط کو پہنچا دیتی، جو آج کے زمانے کے مقابلے میں بھی کارآمد اور موثر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ غالبؔ مغرب سے متاثر تھے۔ کلکتے میں آئی ہوئی مغرب کی نئ ہوا، جس میں نیا نظام صنعت، کاروبار کے نئے طریقے، ڈاک کا نیا نظام، روشنی کا نیا اور متبادل نظام، صاف ستھری اور بڑی بڑی سڑکیں، فن تعمیر کے نئے طریقے، صحافت کا ایک نیا نظام، پریس کا آغاز وغیرہ، یہ وہ نئ مصنوعات ہیں، جنہوں نے غالبؔ کو بے حد متاثر کیا اور یہی وجہ ہے کہ اس کا اظہار غالبؔ نے، اس وقت کُھل کر کیا۔

بالآخر ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو غالب کلکتہ سے واپس دہلی آئے۔ دہلی میں مرزا غالبؔ کو سخت معاشی قحط اور بدترین مالی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ غالب خط افلاس سے نیچے کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ قرض کے بوجھ تلے دب چکے تھے۔ غالبؔ کو اس شدید اور بھیانک صورتحال میں ۱۸۴۰ء دہلی کالج میں استاد کی حیثیت سے مدعو کیا گیا لیکن مرزا اس قدر عزت نفس اور خودی کو اہمیت دیتے تھے کہ یہ کہہ کر نوکری ٹھکرا دی کہ وہاں ان کے استقبال کے لیے کوئی شخص موجود نہ تھا۔

جب سر سید احمد خان نے ''آئین اکبری'' ترتیب دی، جو کہ دراصل جلال الدین محمد اکبر کے زمانے میں ابوالفضل نے لکھی تھی، اس کتاب میں اس زمانے کے دستور، قوانین، شرح محصولات، لگان اور اشیا و اجناس کے مقرر کردہ نرخ وغیرہ تھے۔ سرسید احمد خان نے اس کتاب کی تصحیح کی اور اس پر حواشی کے اضافے کے بعد اسے دوبارہ چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس کے لئے انہوں مرزا غالب سے اس پر تقریظ لکھنے کی درخواست کی۔ اس بابت سرسید کا شاید یہ خیال تھا کہ غالب اس کارنامے پر ان کی ستائش کرے گا، لیکن غالب نے اس کے برعکس اپنی تقریظ میں ایک الگ ہی پیغام بھیجا اور وہ کچھ لکھ دیا جو اس زمانے کے ادیبوں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ شاید غالبؔ کو زمانے کے بدلتے ہوئے انداز کو دیکھ کر بھی اچھا نہیں لگا ہوگا کہ وہ اُس کی تقریظ لکھے، جس کی اُس وقت ضرورت ہی نہیں تھی اور شاید غالب کی نظر میں سرسید کا مقام اعلیٰ و ارفع رہا ہوگا، چونکہ سرسید ایک نام کما چکے تھے، اس لیے غالب کی توقعات سرسید سے کچھ اور ہی ہونگی، یا ہوسکتا ہے غالب کو اس بات کا علم ہوا ہوگا کہ سرسید

نے اس کام کے لیے انگریزی حکومت سے وظیفہ بھی واگذار کرایا تھا اور مسٹر بلاکمین نے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ کا کام بھی اپنے ذمہ لیا تھا۔ شاید غالب کو اس خدشہ نے پریشاں کیا ہوگا کہ انگریز سر سید کو ایسے کاموں میں مشغول رکھنا چاہتے ہیں جسے کوئی اور بھی بہ آسانی انجام دے سکتا ہے اور شاید غالب اُس وقت سر سید سے کوئی اہم کام چاہتے تھے جس کا ذکر پھر اس نے تقریظ میں واشگاف الفاظ میں کرتے ہوئے اپنے شعور اور بیدار مغز ہونے کا ثبوت بھی پیش کیا۔ اس کے باوجود کہ غالب اور سید احمد خان کے خاندانی روابط تھے اور سرسید مرزا غالب کو ادب سے چچا بھی کہتے تھے، غالب نے ان تمام باتوں کو یکسر مسترد کر کے اپنی حکمتِ عملی سے حکیمانہ طرز انداز اختیار کیا۔ حالانکہ اُس وقت سرسید کو یہ تقریظ پسند نہ آئی اور نہ ہی انہوں نے اسکو مذکورہ کتاب میں تقریظ کی حثیت سے شامل کیا، لیکن ہوسکتا ہے غدر کے بعد سرسید کو غالب کی اسی تقریظ نے سائنٹفک سوسائٹی اور علی گڑھ تحریک کی تحریک دی ہوگی۔ کیونکہ غالب نے پہلے ہی فرمایا تھا کہ ہمیں انگریزوں کا مقابلہ جوش سے نہیں علم سے کرنا ہوگا۔

اگر چہ ایک طرف غالب حکیمانہ سوچ کے مالک تھے لیکن دوسری طرف بری عادتوں کے بھی مالک تھے اور ان بری عادتوں میں شراب کے ساتھ ساتھ شطرنج، جوا وغیرہ بھی کھیلتے تھے۔ غالبؔ کی شخصیت کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اوائل عمر سے ہی جوا اور چوسر کھیلنے کے عادی تھے۔ ۱۸۴۱ء کو غالب پہلی بار اس جرم کی پاداش میں جیل بھی گئے۔ ان پر سو روپے جرمانہ بھی عائد ہوا معاشی پسماندگی کے سبب جرمانہ ادا نہ کر سکے اور چار ماہ کی قید کی مزید سزا سنائی گئی۔ غالبؔ کو ۲۵ دسمبر ۱۸۴۷ء کو دوبارہ اسی جرم کی پاداش میں چھ ماہ قید اور دوسو روپے جرمانہ عائد ہوا اس بار مجسٹریٹ کے اثر ورسوخ اور احباب کی سفارش سے صرف تین ماہ جیل میں گزارنے کے بعد رہا ہوئے۔

غالبؔ کی زندگی میں حالات نے اس وقت کروٹ بدلی جب کالے صاحب اور حکیم احسن اللہ خان کی سفارش سے غالبؔ کا تعلق بہادر شاہ ظفر سے قائم ہوا۔ بہادر شاہ ظفر کے استاد شیخ ابراہیم ذوق تھے، لیکن ۱۵ نومبر ۱۸۵۴ء کو ذوق کا انتقال ہوا اور غالبؔ کو بہادر شاہ ظفر کی استادی کا شرف حاصل ہوا۔ بہادر شاہ ظفر نے غالبؔ کو یہ ذمہ داری عائد کی کہ خاندان تیموری کی تاریخ قلم بند کرے۔ غالب کا چھ سو روپے سالانہ مشاہرہ تفویض ہوا۔ ابوالکلام قاسمی نے الطاف حسین کے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ ”جب مرزا غالبؔ ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس موقع پر انہیں نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کہہ کر خطاب کیا اور رسمی طور پر چھے پارچے اور خلعت سے سرفراز کیا۔ اس موقع پر پچاس روپے ماہانہ ان کا وظیفہ مقرر کیا گیا۔“ غالبؔ کی زندگی کو یہ اعزاز واکرام زیادہ دیر حاصل نہیں رہ سکا ان کی زندگی کو ابھی ایک اور طوفان دیکھنا تھا۔ ۲۰ دسمبر ۱۸۵۷ء کو انگریز ہندوستان پر مسلط ہوگئے اور اس بغاوت نامی انتشار نے ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی قدروں کا شیرازہ بکھیر کے رکھ دیا۔ بہادر شاہ ظفر گرفتار کر لئے گئے۔ غالبؔ کے مقدر کو ایک بار پھر گرہن لگ گیا۔ انہوں نے اتنی

صعوبتوں اور اذیتوں کے بعد بھی حوصلہ نہیں ہارا بلکہ شعر و ادب سے خود کو وابستہ رکھا۔ اس ہنگامہ خیز صورتحال میں انہوں نے ''دستنبو'' لکھی، جو ۱۸۵۸ء کو شائع ہوئی۔ ۱۸۶۲ء کے اوآئل میں فارسی کی معروف لغت برہان قاطع کی غلطیاں نشان زد کیں اور ''قاطع برہان'' کے نام سے اپنی کتاب کو منظر عام پر لایا۔ اس حوالے سے مالک رام اپنی کتاب ''ذکر غالب'' میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''یہ ایام میرزا پر بھی نہایت مصیبت کے گزرے آمدنی بالکل مفقود اور خرچ بدستور۔ بارے ان کے بعض ہندو دوستوں نے اس زمانے میں ان کی خبر گیری کی۔ ہرگوپال تفتہ میرٹھ سے روپیہ بھیجا کئے مہیش داس انھیں شراب مہیا کرتے رہے۔ ان کے علاوہ منشی ہیرا سنگھ پنڈت شیو جی رام اور ان کے لڑکے بال کمند نے بھی حتی الوسیع ان کی خدمت میں کوتاہی نہیں کی۔ میرزا نے دستنبو میں ان سب کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ میں نے ان حضرات کا ذکر اس لئے کیا کہ جہاں ان کی عنایتوں کا شکریہ مجھ پر واجب تھا وہیں میں چاہتا ہوں کہ میرے دوسرے دوستوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ میرے جیسا کثیر الاحباب شخص اس زمانے میں کیسے بسر کرتا رہا۔ اگر شہر میں یہ چاروں صاحب بھی موجود نہ ہوتے تو کوئی میری بے کسی کا گواہ تک نہ ہوتا۔''

(مالک رام، ذکر غالب، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی، ص،۷۲۔۷۱)

نواب رام پور یوسف علی خان ناظم سے غالبؔ کے اچھے مراسم تھے۔ غالبؔ نے نواب کی مدح میں ایک قصیدہ بھی بھیجا تھا جس سے انہوں نے کافی پسند فرمایا۔ ۲۷ جنوری ۱۸۶۰ء کو مرزا غالبؔ نے رامپور کا پہلا سفر کیا تھا لیکن یہاں دو ماہ سے زیادہ قیام نہیں کیا اور واپس دلی روانہ ہوئے۔ دوسری دفعہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو اس وقت رامپور گئے جب نواب یوسف علی خاں کے بعد ان کے فرزند نواب کلب علی خان مسند نشین ہوئے۔ ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو واپس دلی لوٹ رہے تھے کہ دریائے رام گڑھ میں تند و تیز سیلاب اور پل بہہ جانے کی وجہ سے شدید مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ شدید بخار اور سردی کی وجہ سے غالبؔ کے پورے اعصاب میں درد سرایت کر گیا اور پورا جسم جواب دینے لگا۔ غالبؔ کے آخری ایام کی تصویر کشی ڈاکٹر خلیق انجمن نے یوں پیش کی ہے:

> ''آج کتنے عرصے بعد ہم غالبؔ کے دیوان خانے میں آئے ہے وہی غالبؔ، وہی احباب اور وہی شاگرد لیکن محفل کی باغ و بہار، فضا کو کیا ہو، اوہ شگفتگی کیا ہوئی، ہر چہرے پر گہری اداسی کیوں؟ بات یہ ہے کہ جس کے دم سے محفل میں رونق تھی وہ صاحب فراش ہے۔ اب غالبؔ اٹھ سکتے ہیں

نہ بیٹھ سکتے ہیں۔ کسی نے لکھ کر خیریت پوچھی تو رک کر جواب دے دیتے ہیں۔ سامعہ مر گیا تھا آب بادہ بھی ضعیف ہوگیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں، سب مضمحل ہیں۔

غالبؔ خاموش لیٹے ہیں کبھی کبھی اپنا ایک مصرع

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

پڑھ لیتے ہیں۔''

آخر کار ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو اردو شاعری کا یہ شمس بازغہ ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا اور حضرت نظام الدین اولیاء کے قرب میں موجود قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

19.4 نمونہ امتحانی سوالات:

سوال نمبر۱: اسداللہ خان غالب کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

جواب: اسداللہ خان غالبؔ کی پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۲ھ بمطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں ہوئی۔

سوال نمبر۲: والد کے انتقال کے بعد غالبؔ کی پرورش کس نے انجام دی؟

جواب: والد کے انتقال کے بعد غالبؔ کی پرورش ان کے چچا نصر اللہ بیگ نے انجام دیں۔

سوال نمبر۳: دلی کے ماحول سے غالبؔ کی شخصیت پر کیا اثر پڑا؟

جواب: دلی کے ماحول سے غالبؔ کی ادبی اور علمی صلاحیتوں کو تحریک عطا ہوئی اور ان کے فکر وفن میں کشادگی کا جوہر پیدا ہوا۔

سوال نمبر۴: غالبؔ کے والدین کا نام بتائیے؟

جواب: غالبؔ کے والدین میں مرزا عبداللہ بیگ (والد) اور عزت النساء بیگم (والدہ) ہے۔

سوال نمبر۵: بہادر شاہ ظفر نے کب اور کون سے خطابات سے غالبؔ کو نوازا؟

جواب: بہادر شاہ ظفر نے ۱۸۵۰ء میں غالبؔ کو نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ کے خطابات سے نوازا۔

چند ایک اضافی سوالات:

سوال نمبر۱: غالب کھانے میں کیا پسند کرتے تھے؟

جواب: صبح اٹھتے ہی غالب خالی پیٹ بادام کھاتے تھے۔ دوپہر اور رات کے کھانے میں عام طور پر بلکہ زیادہ تر گوشت تناول

کرتے تھے اور گوشت میں مرغ، کبوتر، بٹیر، بکرے اور دمبے کا گوشت پسند کرتے تھے۔ دالوں میں چنا پسند فرماتے تھے۔ پھلوں میں انگور اور آم پسند تھا - ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آم کے موسم میں نواب علاء الدین احمد خاں نے انہیں خط لکھ کر لوہارو آنے کی دعوت دی تو انہوں نے جواب میں لکھا ''کہ میں اندھا ہوں کہ اس موسم میں دہلی چھوڑ کر لوہارو جاؤں۔ اس ویرانے میں نہ آم نہ انگور نہ کوئی اور لطف ناصاحب! آج کل نہیں آسکتا۔''

سوال نمبر۱: غالب کی تصنیفات کے حوالے سے آپ کیا جانتے ہیں؟

جواب: ۱۸۵۸ء میں فارسی زبان میں شائع ہونے والی ایک کتاب 'دستنبو' دراصل اپنی نوعیت کا ایک تذکرہ ہے جس میں ۱۸۵۰ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کے حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی نے کیا اس کا ترجمہ اردو زبان میں کیا ہے۔

"مہرنیمروز" کا ترجمہ غالب نے فارسی کیا۔

۱۸۶۱ء میں "قاطع برہان" شائع ہوا اور ۱۸۵۶ء میں "دُرفش کاویانی" شائع ہو کر سامنے آیا۔

فارسی کلام کی پہلی اشاعت "میخانہ آرزو" کے نام سے ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا۔

"سبدچین" کے نام سے ۱۸۶۷ء میں فارسی کلام شائع ہوا۔ اس مجموعے میں مثنوی ابر گہربار کے علاوہ وہ کلام بھی شامل ہے جو فارسی کے کلیات میں شامل نہیں ہو سکا تھا۔

پہلی بار غالب کے اردو خطوط کا یہ مجموعہ ۱۸۶۸ء میں "عود ہندی" کے نام سے شائع ہوا۔

بعدازاں ۱۸۶۹ء میں "اردوئے معلیٰ" کے نام سےغالب کے اردو خطوط کا ایک اور مجموعہ شائع ہوا۔

جو خطوط خطوط غالب کی زندگی میں شائع نہیں ہوئے ان میں ترجیحی بنیادوں پر وہ خطوط شامل ہیں جو انھوں نے دربار رامپور کو لکھے تھے اور جسے بعد میں امتیاز علی خاں عرشی نے مرتب کر کے "مکاتیب غالب" کے نام سے ۱۹۳۷ء میں شائع کیا۔ خطوط کے حوالے سے بعد میں خلیق انجم نے بھی متعدد جلدوں پر غالب کے خطوط شائع کیے۔

غالب نے مرزا عارف کے بچوں کے لیے آٹھ صفحات پر مشتمل یہ ایک مختصر رسالہ "قادرنامہ" لکھا تھا۔

"دیوانِ غالب" غالب کی اردو شاعری کا مجموعہ ہے، جسے ہندوستان کی الہامی کتاب بھی کہا گیا ہے۔

19.5: اس اکائی میں ہم نے آپ کو غالبؔ کی زندگی اور ان کے خاندان کے بارے میں بتایا۔ تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکے کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ غالبؔ کی زندگی میں جو اتار چڑھاؤ آئے اور غالبؔ کو جن نشیب و فراز سے گزرنا پڑا، ان سے بھی آپ واقف ہوئے۔ آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی۔ آخر میں امتحانی سوالات دئے گئے اور مشکل الفاظ کا معنی بھی فرہنگ کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور سفارش کردہ کتب کی فہرست بھی دی جارہی ہے کہ آپ اپنے طور پر

مطالعہ کر سکیں۔

19.6: فرہنگ

تقلیب: الٹ پلٹ، تغیر و تبدل

تازہ دم: چست، چاق و چوبند

انارکی: انتشار، لاقانونیت

پشتینی: موروثی، باپ دادا سے منسوب

نابغہ روزگار: اپنے زمانے کا سب سے ذہین و فطین

مہتمم بالشان: شاندار، عظیم

منابع: نکلنے کی جگہ، سوتے

پژمردہ: افسردہ، مرجھایا ہوا

سانحہ ارتحال: وفات پا جانے کا حادثہ

سامراج: ملوکیت کا نظام، وہ نظام حکومت جو نوآبادیات پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لئے قائم کیا جائے۔

مخاصمت: دشمنی، عداوت، مخالفت

ارتسام: نقش، پرتو (مجازاً)، اثر

ہبوط: نیچے اترنا۔

امتداد زمانہ: طویل زمانہ، مدت کے بعد

کوکب درخشاں: چمکتا ستارہ

افراط: کثرت، فراوانی

قابل تعزیر: قابل سزا

مشاہرہ: ماہانہ تنخواہ، مقررہ وظیفہ

19.7: سفارش کردہ کتب

۱۔ الطاف حسین حالی، یادگار غالبؔ

۲۔ غلام رسول مہر، غالبؔ

۳۔ یوسف سلیم چشتی، شرح دیوان غالب۔
۴۔ مالک رام، ذکر غالبؔ
۵۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط، ۵ جلدیں۔
۶۔ گوپی چند نارنگ، غالب معنی آفرینی جدلیاتی وضع شونیتا اور شعریات۔
۷۔ حکیم عبدالحمید، مطالعات کلام غالب۔
۸۔ مجنون گورکھپوری، غالبؔ، شخص اور شاعر
۹۔ قاضی عبدالودود، جہاں غالب۔
۱۰۔ نثار احمد فاروقی، تلاش غالب۔

اکائی 20 غالبؔ اور پنشن کا قضیہ

ساخت

20.1 اغراض و مقاصد
20.2 تمہید
20.3 غالبؔ اور پنشن کا قضیہ
  20.3.1 غالب کی پنشن کا پس منظر
  20.3.2 قضیہ کے اسباب اور غالب کی ابتدائی کوششیں
  20.3.3 غالب کا سفر کلکتہ
  20.3.4 تقسیم پنشن پر غالبؔ کے اعتراضات اور فریق مخالف کا جواب
  20.3.5 مقدمے کی پیروی
  20.3.6 ماحصل
20.4 آپ نے کیا سیکھا؟
20.5 اپنا امتحان خود لیجیے
20.6 سوالوں کے جوابات
20.7 فرہنگ
20.8 کتب برائے مطالعہ

20.1 اغراض و مقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

☆ غالب کی پنشن کے پس منظر سے واقف ہوں گے۔

☆ نصر اللہ بیگ کے پس ماندگان کی پرورش و پرداخت کے لیے کسے کتنی پنشن دی گئی؟ سے روشناس ہوں گے۔

☆ پنشن سے متعلق غالب کے مطالبات اور اعتراضات سے واقف ہوں گے۔

☆ غالب کے سفر کلکتہ کی روداد سے متعارف ہوں گے۔

☆ مقدمے کی پیروی کے مراحل اور اس کے نتائج سے باخبر ہوں گے۔

20.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائی میں آپ نے غالب کے سوانحی حالات و کوائف کا مفصل مطالعہ کر کے ان کی سیرت و شخصیت کے نمایاں پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اب آپ زیر نظر اکائی میں غالب اور ان کی پنشن کے قضیہ کے متعلق تفصیل سے پڑھیں گے۔ آپ یہ جانتے ہوں گے کہ نصر اللہ بیگ غالب کے چچا تھے، جن کی جائداد سے انھیں پنشن ملتی تھی۔ غالبؔ کے پنشن کا قضیہ ان کی زندگی میں بھی اور ان کے بعد بھی محققین کے لیے ایک مشکل امر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پنشن کے بارے میں متضاد شہادتوں کا ہونا اور اس قضیہ کے متعلق خود غالبؔ کی تحریروں میں مختلف بیانات کا ملنا محققین و ناقدین کے لیے پیچیدہ مسئلہ بن گیا۔ غالبؔ نے اپنی پنشن کے لیے کلکتہ کا ایک طویل سفر بھی طے کیا تھا۔ اس سفر میں غالب کے ساتھ بہت سے تاریخی واقعات اور ادبی معرکے نما ہونے کی وجہ سے یہ موضوع نہایت اہمیت کا حامل ہو گیا۔ لہٰذا اس اکائی میں آپ ان کی پنشن کے قضیہ کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

20.3 غالبؔ اور پنشن کا قضیہ

20.3.1 غالبؔ کی پنشن کا پس منظر

غالبؔ کے دادا فوقان بیگ ۱۷۵۰ کے آس پاس محمد شاہ کے زمانہ میں سمرقند سے دہلی آئے اور شاہی فوج میں ایک اہم عہدے پر فائز ہوئے۔ دادا کی تین اولادیں ہوئیں ایک لڑکی اور دو لڑکے عبداللہ بیگ خاں اور نصر اللہ بیگ خاں۔ اول الذکر عبداللہ بیگ خاں غالبؔ کے والد گرامی ہیں۔ جن کا انتقال ۱۸۰۲ء میں ہوا۔ اس وقت غالبؔ کی عمر محض پانچ سال تھی۔ غالب کے والد والی الور راجہ راؤ کی فوج کی طرف سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ اب غالبؔ کی پرورش ان کے چچا نصر اللہ بیگ نے اپنے ذمہ لے لی۔ غالب کو دوسرا بڑا صدمہ اس وقت لگا جب ۱۸۹۶ء میں والد کے انتقال کے محض تین سال بعد ان کے چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔ چچا نصر اللہ بیگ آگرہ قلعہ کے قلعہ دار تھے۔ جب انگریزوں نے لارڈ لیک کی سربراہی میں آگرہ کی طرف پیش قدمی کی تو نصر اللہ بیگ نے قلعہ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اس سے خوش ہو کر انگریزوں نے ان کو عہدے پر برقرار رکھا۔ بعد میں اس کی پاداش میں ‘‘سونک’’ اور ‘‘سونسا’’ نام کے دو پرگنے انہیں دیے گئے۔ نصر اللہ بیگ کی بیوی اور بچے کا انتقال ان کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا، اس لیے انگریزی سرکار نے ان کی جاگیر ضبط کر کے ان کے ورثا کے لیے پنشن مقرر

کردی۔ نصر اللہ بیگ کے ہم نسبتی (سالے) نواب احمد بخش کو انگریزی سرکار کی طرف سے فیروز پور جھرکہ کا علاقہ دیا گیا۔ سرکار نے نواب احمد بخش کے ۲۵ ہزار روپئے سالانہ اس شرط پر معاف کردیے کہ وہ ۵۰ سواروں کے دستے بہ وقت ضرورت انگریزی سرکار کی مدد کے لیے تیار رکھیں گے اور نصر اللہ بیگ کے پس ماندگان کی پرورش و پرداخت کرتے رہیں گے۔ پرورش و پرداخت کے لیے پنشن کی تقسیم اس طرح ہوئی:

- خواجہ حاجی کو دو ہزار روپئے سالانہ
- نصر اللہ بیگ کی والدہ اور اور تین بہنوں کو ڈیڑھ ہزار روپئے سالانہ
- غالبؔ اور ان کے بھائی مرزا یوسف کو ڈیڑھ ہزار روپئے سالانہ

غالبؔ کو جو وظیفہ ملتا تھا اس میں سے وہ اپنے بھائی مرزا یوسف کو آدھی رقم سالانہ دیتے تھے۔ بعد میں ان کی بیوی کی شکایت پر سرکار نے اس رقم سے چار سو روپئے ان کی بیوی کے لیے مقرر کردیے۔

مالک رام کے مطابق آگرے میں غالب کو ”کوئی تنگی نہ تھی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ روپئے پیسے کی افراط تھی۔“ دہلی منتقلی کے بعد پنشن کی رقم سے گزر بسر ہو جاتا تھا، لیکن دھیرے دھیرے آمدنی اور خرچ کا توازن غالبؔ کے شاہانہ خرچ کی وجہ سے بگڑتا گیا۔

20.3.2 قضیہ کے اسباب اور غالب کی ابتدائی کوششیں

غالب ۱۸۲۶ تک فیروز پور جھرکہ سے اپنی پنشن وصول کرتے رہے۔ ملک حسن اختر نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ غالبؔ اپنے خسر (سسر) کی زندگی تک پنشن کے معاملے پر خاموش کیوں تھے۔ ممکن ہے کہ غالب کے سسر نے نواب احمد بخش سے پنشن کے متعلق کوئی نزاعی معاملہ پیدا نہ ہو، اس لیے ان کو روک رکھا ہو، کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ اس سے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ غالبؔ نے نواب احمد بخش کے سامنے پنشن کا معاملہ اس وقت اٹھایا جب ان کے سسر اور نواب احمد بخش کے بھائی نواب الٰہی کا ۱۸۲۶ء میں انتقال ہو گیا۔ غالبؔ کا کہنا یہ تھا کہ نواب احمد بخش نے اپنی مرضی سے خواجہ حاجی کو اس میں شامل کیا ہے۔ اس میں انگریز سرکار کی مرضی کا دخل نہیں ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ خواجہ حاجی کسی طریقے سے نصر اللہ بیگ کے رشتہ داروں میں نہیں آتے ہیں، لہٰذا ان کو رشتہ داروں میں شمار کرکے وظیفہ کی ایک بڑی رقم دینے کی وجہ سے نصر اللہ بیگ کے حقیقی ورثا کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ غالبؔ نے اس مسئلہ پر جو خط انگریزی حکومت کے پاس بھیجا تھا اس کے مطابق انہوں نے کلکتہ جانے سے پہلے کئی مرتبہ اس ناانصافی کی شکایت نواب احمد بخش سے کی تھی اور ان سے اس ناانصافی کے ازالہ کے لیے بھی کہا تھا۔ نواب صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ خواجہ حاجی کے انتقال کے بعد وظیفے کی رقم ان کے حقیقی ورثا میں تقسیم کردی جائے گی۔ جب خواجہ حاجی کا انتقال ہوا تو ان کا وعدہ یاد دلانے کے لیے غالب ایک بار پھر فیروز پور گئے، لیکن نواب صاحب نے اپنی بعض مجبوریوں کا حوالہ دیا اور کہا کہ ریزیڈنٹ دہلی اختر لونی سے ابھی

تعلقات کشیدہ ہیں، اس لیے حالات کے سازگار ہونے کا انتظار کریں۔ ۱۸۲۵ء میں جب جنرل لونی کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ سر چارلس مٹکاف ریزیڈنٹ مقرر ہوئے۔ بھرت پور کے راجہ کی مدد کے لیے مٹکاف کو بھرت پور جانا ہوا تو غالبؔ اس امید میں نواب صاحب کے ساتھ بھرت پور گئے کہ وہ ان کا تعارف مٹکاف سے کرا دیں گے۔ وہ تین دنوں تک فیروز پور میں رہے، لیکن نواب صاحب نے مٹکاف سے ان کا تعارف نہیں کرایا۔ اب غالبؔ نواب صاحب سے مایوس ہو چکے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا قضیہ خود مٹکاف کے سامنے رکھیں گے۔ پنشن کے لیے غالبؔ کی جدوجہد کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب انہیں معلوم ہوا کہ نواب گورنر جنرل بہادر دہلی آ رہے ہیں، انہیں کہیں سے خبر ملی کہ مٹکاف ان کے استقبال کے لیے کانپور جاسکتے ہیں تو انہوں نے اس امید میں کانپور کا سفر کیا کہ کانپور میں یا واپسی میں اگر راستے میں موقع ملا تو مٹکاف سے اپنے احوال بیان کر دیں گے۔

غالب کی بدقسمتی دیکھیے کہ کانپور پہنچ کر وہ ایسے بیمار ہوئے کہ ان کے لیے بستر سے اٹھنا محال ہو گیا۔ ایسے میں وہ کیا کر سکتے تھے۔ بغرض علاج لکھنؤ گئے۔ ۲۰ نومبر ۱۸۲۶ء کو بادشاہ اودھ کی گورنر جنرل سے ملاقات کے وقت وہ لکھنؤ میں ہی صاحب فراش تھے۔ غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تقریباً پانچ ماہ لکھنؤ میں رہے۔ غالبؔ کے بزرگوں کے نواب باندہ سے پرانے تعلقات تھے۔ چنانچہ وہ باندہ چلے گئے جہاں تقریباً چھ مہینے رہے۔ حنیف نقوی کے مطابق یہ مدت زیادہ سے زیادہ تین مہینہ رہی ہوگی۔ اس درمیان نواب بہادر جنرل بھی کلکتہ واپس چلے گئے۔

20.3.3 غالب کا سفر کلکتہ

غالبؔ قرض خواہوں کے خوف سے واپس دہلی نہیں جانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح پنشن کا مسئلہ حل ہو جائے پھر دہلی واپس جائیں۔ انہیں ایک راستہ نظر آیا کہ کسی طرح انگریزی حکومت کے دارالخلافہ میں حاضری دے کر سرکار عالیہ میں درخواست دی جائے۔ غالب خشکی کے راستے بنارس ہوتے ہوئے گھوڑے کی سواری سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے۔ بنارس سے کلکتہ روانہ ہونے کی تاریخ ۲۷ دسمبر ۱۸۲۷ء ہے۔ مرشد آباد میں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ نواب احمد بخش کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کے بیٹے نواب شمس الدین احمد خاں جانشین بنے ہیں۔ غالب کا دعوی چوں کہ نصر اللہ بیگ کی جائداد سے ملنے والی پنشن پر تھا، اس وجہ سے انہوں نے سوچا کہ نواب احمد بخش ہوں یا نواب شمس الدین، اس سے ان کے پنشن کے قضیے پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لہٰذا وہ بغیر رکے کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ ترپین (۵۳) دن کا طویل سفر طے کر کے ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے۔ غالبؔ دیڑھ سال یعنی ۱۴ اگست ۱۸۲۹ء تک کلکتہ میں مقیم رہے۔ اس درمیان اپنے مقدمے کی پیروی کے ساتھ ادبی معرکے پر بھی انہیں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

کلکتہ میں غالب کے کئی ایسے دوست بنے جن سے زندگی کے آخری ایام تک ان کی خط و کتابت رہی۔ کلکتہ سے جانے کے بعد بھی وہ برابر کلکتہ کو یاد کرتے تھے جس کی ایک جھلک ان اشعار میں ملتی ہے:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

20.3.4 تقسیم پنشن پر غالب کے اعتراضات اور فریق مخالف کا جواب

غالب کو جو پنشن مل رہی تھی اس کے تعلق سے بنیادی طور پر انہیں دو شکایتیں تھیں۔ پہلی یہ کہ نواب احمد بخش نے سرکار کی ایما کے خلاف مجموعی پنشن کی رقم دس ہزار سے گھٹا کر پانچ ہزار کر دی ہے۔ دوسری شکایت یہ تھی خواجہ حاجی کا تعلق نصر اللہ بیگ کے خاندان سے نہیں تھا، اس لحاظ سے وہ نصر اللہ بیگ کے وارث نہیں بن سکتے تھے۔ اس کے باوجود نواب احمد بخش نے ان کو بھی ورثا میں شمار کر کے ان کا حصہ مقرر کر دیا۔ اس سلسلے میں سب سے مستند دستاویز خود غالب کی تحریر ہے جو انہوں نے کلکتہ پہنچ کر ۲۸ مئی ۱۸۲۸ء کو سرکار کے پاس جمع کرائی تھی۔ اس خط کا اردو ترجمہ مالک رام کی کتاب فسانہ غالب میں اور پرتھوی چندر کی کتاب ''جاگیر غالب'' موجود ہے۔ اس درخواست میں غالب نے اپنی پنشن کے لیے نواب احمد بخش سے جو درخواستیں کی تھیں اس کی روداد بیان کی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے مطالبات کا بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ خواجہ حاجی کا تعلق نصر اللہ بیگ کے خاندان سے نہیں ہے۔ وہ نصر اللہ بیگ خان کے گھرانے کا ایک ملازم تھا۔ اس نے نصر اللہ بیگ کے سارے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا اور ستر اسی سواروں، ایک ہاتھی اور اسباب حرب کے ساتھ نصر اللہ بیگ کے سسر نواب احمد بخش خاں سے جا ملا۔ وہ لکھتے ہیں کہ سوائے اس کہ خواجہ حاجی کی والدہ نصر اللہ بیگ خاں کی ماں کی بہن یعنی خالہ کی بیٹی تھیں، ان میں اور نصر اللہ بیگ میں کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اس لیے ان کو دیا جانے والا وظیفہ نصر اللہ بیگ کے حقیقی وارثین کے ساتھ ناانصافی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”بحیثیت مجموعی میں نہ تو احمد بخش خاں کی مقرر کی ہوئی رقم سے مطمئن ہوں اور نہ ان کے رقم کی تقسیم کے طریقہ کار سے اور اب میں مزید برداشت نہیں کرسکتا کہ میں اپنے حقوق کسی اور کے ہاتھ سے وصول کروں اور نہ یہ برداشت کرسکتا کہ ہوں کہ میرے ایک ادنی ملازم کو میرے برابر کھڑا کر دیا جائے۔“
>
> (غالبؔ کا سفر کلکتہ، خلیق انجم، ص: ۹۸-۹۷)

غالبؔ نے حکومت کے سامنے مطالبات رکھے کہ حکومت نصر اللہ خاں کے وارثوں کا تعین خود کرے۔ ہر ایک وارث کو الگ الگ پنشن دی جائے اور غالب کو ان سب رشتہ داروں پر نگراں مقرر کیا جائے۔ انھوں نے حکومت سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ نواب احمد بخش نے جو رقم ان کے جائز وارثوں کو نہیں دی ہے اور سواروں کے دستے کو تحلیل کر کے جو رقم بچائی ہے اس کو ان سے واپس لیا جائے۔

نواب شمس الدین کی طرف سے پیش ہونے والے جواب میں غالب کے دعوے کی تردید کی گئی اور کہا گیا کہ غالب خواجہ حاجی کے وارثین کی حق تلفی کرنا چاہتے ہیں۔ خواجہ حاجی کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ ان کا نام سرکار نے زیر کفالت افراد میں سب سے پہلے نمبر پر رکھا ہے۔ سند میں متوسلین کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا اطلاق رشتہ داروں دوستوں اور غیروں پر بھی ہوتا ہے، جن کا تعلق کسی دوسرے شخص سے ہو۔ خواجہ حاجی اس لحاظ سے نصر اللہ بیگ کے خصوصی متوسل ہیں اور دوسرے رشتے دار عمومی متوسل ہیں۔

غالبؔ نے اپنی درخواست میں کچھ ایسی باتیں بھی لکھیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس پورے معاملے سے وہ بے حد دلبرداشتہ تھے، وہ لکھتے ہیں:

> ”میرا ارادہ ہے کہ اگر حکومت نے میرے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کی تلافی کر دی اور میرے دعوؤں کی شنوائی کی تو بامراد و مطمئن اپنے گھر چلا جاؤں گا۔ اور آرام سے زندگی بسر کروں گا اور اپنے غریب بھائی کے معالجے کی کوشش کروں گا اور اگر ارباب حکومت میرے مقدمہ میں تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کریں گے، تو میں یہاں سے جدھر منہ اٹھے گا چلا جاؤں گا۔ اپنے لباس کو تار تار کر دوں گا اور خاک چھانتا عرب اور دوسرے ممالک کے اجنبی شہروں میں ساری زندگی بھیک مانگ کر گزار دوں گا، کیوں کہ اس اعزاز کے ساتھ کہ حکومت سے میرے مراسم بڑے اچھے ہیں۔ میں ہندوستان میں کسی کے در پر بھیک مانگنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ (غالبؔ کا سفر کلکتہ، خلیق انجم، ص: ۹۷)

اس سلسلے میں جب نواب شمس الدین خاں سے وضاحت طلب کی گئی تو انھوں نے جواب میں کہا کہ سرکار نے جو وظیفہ غالب کے لیے مقرر کیا ہے وہ ان کو برابر مل رہا ہے۔ غالبؔ کی درخواست کو مبالغہ آمیز قرار دیتے ہوئے

انہوں نے لکھا کہ وظیفہ میں اضافہ کا امکان اس لیے نہیں کہ ''انہیں نصر اللہ خاں مرحوم کے ورثا کے لیے جو رقم ملتی ہے، میں ان کو دے دیتا ہوں۔'' جہاں تک پچاس سواروں کی بات ہے تو انہیں نے اس کو اپنے اور حکومت کے درمیان کا معاملہ قرار دے کر کہا کہ ''اسد اللہ خاں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

20.3.5 مقدمے کی پیروی

کلکتے جانے سے پہلے غالب نے نواب باندہ سے نواب اکبر علی خاں کے لیے سفارشی خط لکھوا لیا تھا۔ غالب یہ سفارشی خط لے کر نواب اکبر علی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ غالب کو کسی ذریعہ سے معلوم ہوا تھا کہ نواب صاحب کے تعلقات کلکٹر سے اچھے ہیں، لیکن نواب صاحب نے بتایا کہ اس وقت ان کے تعلقات کلکٹر سے اچھے نہیں ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے اس سلسلے میں غالب کی ہر ممکن مدد کی۔ غالب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں پر جو کچھ بھی کرنا ہے، خود سے کرنا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیا۔ انہیں خبر ملی کی گورنر جنرل کا دربار لگنے والا ہے۔ غالب دو دن پہلے منشی سے مل کر دربار میں شامل ہونے کی درخواست دی جو منظور کر لی گئی۔ گورنر جنرل نے فرداً فرداً سب سے ملاقات کی۔ غالب نے دو اشرفیاں نذرانے کے طور پر پیش کیں جو انہوں نے واپس کر دیا، لیکن انہیں کوئی خلعت نہیں ملی۔

گورنر جنرل کو بھیجی گئی ہر درخواست پہلے ولیم فریزر کے پاس پہنچتی تھی۔ اگر وہ درخواست لائق قبول ہوتی، تو اس کا ترجمہ کر کے صاحبان کونسل کی خدمت میں پیش کرتے تھے ورنہ رد کر دیا کرتے تھے۔ ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء کو غالبؔ اپنی درخواست لے کر ولیم فریزر کے پاس پہنچے جو انہوں نے اپنے پاس رکھ لی۔ غالب کے مطابق ولیم فریزر نے ان کی تعظیم و تکریم کے لیے عطر اور پان سے تواضع کی۔ کھڑے ہو کر سلام کیا۔ جس سے غالب کو اپنی مطلب برآوری کی امید بندھی۔ ایک اور انگریز افسر اسٹرلنگ کو غالب سے ہمدردی تھی۔ وہ پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں حکومت کے معتمد فارسی اور ڈپٹی سکریٹری تھے۔ غالب نے ان کی خدمت میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔ انہوں نے اور ولیم فریزر نے غالبؔ سے کہا کہ انہیں قاعدے کے مطابق اپنی درخواست پہلے دہلی کے ریزیڈنٹ کے پاس جمع کرنی چاہئے تھی۔ چنانچہ انہوں نے یہ کہہ کر درخواست اپنے پاس رکھ لی کہ آپ اپنی درخواست دہلی کے ریزیڈنٹ کے پاس جمع کرا دیں اور پھر وہ اسے کونسل کے پاس جمع کرا دیں گے۔ غالب نے طے کیا کہ وہ دہلی میں رہ کر ہی درخواست اپنے وکیل ہیرا لال کے توسط سے جمع کرائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ڈاک سے مختار نامہ اور ضروری کاغذات بھیج دیے۔ جس کو ان کے وکیل نے دہلی کے زیڈنٹ آفس میں جمع کرا دیے۔ ۱۷ اپریل ۱۸۲۹ء کو دہلی کے ریزیڈنٹ کا خط موصول ہوا جس میں بتایا گیا تھا کہ ان کی درخواست کو متعلقہ حکام تک پہنچا دی گئی ہے۔ غالبؔ نے گورنر جنرل سے ملاقات میں انہیں یہ خط دکھایا تو انہوں نے کہا کہ ریزیڈنٹ آپ پر نظر عنایت رکھتے ہیں، وہ جلد ہی آپ کے دعوؤں کی تشخیص کر کے رپورٹ بھیجیں گے۔

اس درمیان غالب کو معلوم ہوا کہ گورنر جنرل قافلے کے ساتھ دہلی جا رہے ہیں۔ غالب نے سوچا کہ ریزیڈنٹ کی رپورٹ آنے میں دو تین ماہ تو لگ ہی جائیں گے۔ اس لیے گورنر جنرل سے پہلے ہی دہلی پہنچ جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہیں پر کوئی بات بن جائے۔ اس مرتبہ غالب نے پانی کا راستہ اختیار کیا۔ غالب کی قسمت نے اس دفعہ بھی ان کا ساتھ نہیں دیا۔ گورنر جنرل نے بنارس پہنچ کر اپنا ارادہ بدل دیا اور واپس کلکتہ چلے آئے۔

غالب جب دہلی پہنچے تو معلوم ہوا کہ بدعنوانی کے الزامات کی وجہ سے دہلی کے ریزیڈنٹ کو برطرف کرکے ان کی جگہ فرانس ہاکنس کا تقرر کردیا گیا ہے۔ غالب کے بقول وہ ایک علم دوست انسان تھے۔ غالب نے ہاکنس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا۔ غالب نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ ہاکنس نے ایک گھنٹہ تک ان سے قصیدہ سنا اور کلکتے اور ان کے مقدمے کی بابت پوچھتے رہے۔

دہلی کے قائم مقام ریزیڈنٹ ایف ہاکنس نے گورنر جنرل کو اپنی ۵ مئی ۱۸۳۰ء کی رپورٹ میں غالب کی شکایت کو بے بنیاد قرار دے دیا۔ اس کے جواب میں چیف سکریٹری نے قائم مقام ریزیڈنٹ کو لکھا کہ گورنر جنرل آپ کی رائے سے متفق ہیں کہ غالب کی شکایت بے بنیاد ہے۔ غالب کے مطابق ان کے دعوے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ لارڈ لیک کا وہ دستاویز تھا جس کو وہ نقلی قرار دیتے تھے، لیکن حکومت کے ذمے داران کا اصرار تھا کہ یہ دستاویز اصلی ہے۔

غالب نے ہمت نہیں ہاری۔ انہوں نے ۷ جولائی ۱۸۳۰ء میں ایک مرتبہ پھر گورنر جنرل کو عرض داشت بھیج کر مقدمے پر نظر ثانی کی درخواست کی۔ غالب کی یہ درخواست قبول کرلی گئی۔ اس پورے مقدمے میں غالب کے حق میں سب سے امید افزا رپورٹ ۱۰ اگست ۱۸۳۰ء کی وہ رپورٹ ہے جو جی سوئنٹن چیف سکریٹری برائے حکومت ہند نے لکھا تھا۔ اس میں اس نے کئی سوالات قائم کیے تھے۔ مثلاً:

> ''اس (غالب) کی بار بار اور براہ راست اپیل نے مجھے تمام کاغذات دیکھنے اور گورنمنٹ کو مذکورہ بالا بیان پر غور کرنے کی زحمت دینے کی ترغیب بیانات کی بنا پر جیسا کہ میں سمجھتا ہوں اسداللہ کی شکایات بالکل بے بنیاد نہیں ہیں۔'' (جاگیر غالب، ص:۶۱)

> ''شمس الدین خاں کی جواب میں آئی ہوئی چٹھی جو مسٹر ہاکنس نے اپنے مراسلہ مورخہ ۵ مئی ماہ گزشتہ کے ساتھ بھیجی ہے، وہ بہت لاابالی انداز میں لکھی گئی ہے اور اسداللہ کے تمام دعووں کو یہ کہہ کر ٹال دیا ہے کہ وہ رومان پیدا کرکے شاعرانہ مراعات سے فائدہ اٹھاتا ہے، لیکن مقدمے پر سنجیدگی سے غور ہونا چاہیے۔ احمد بخش کی سند مورخہ ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو پرکھنا چاہیے، جو اصلی ہے اور جس کی تصدیق گورنر جنرل بہ کونسل ہوچکی ہے۔ اس کی ایک نقل اسی تاریخ کے مراسلہ سرجان مالکم کے ہمراہ ملے گی، وہ عطیہ حقیقتاً دس ہزار روپے سالانہ نصراللہ خاں کے

> خاندان کے لیے تفویض ہوا ہے، لیکن بد قسمتی سے سند مورخہ ۴ مئی ۱۸۰ غیر واضح انداز میں لکھی ہوئی ہے اور رقم کے تعین کا ذکر نہیں اور لگان میں ۲۵ ہزار سے ۱۵ ہزار روپئے کی تخفیف نصر اللہ خاں کے خاندان کی پرورش اور کفالف کے خاص مقصد کے لیے ہے۔ یہ مذکورہ بالا تخفیفات اور شرائط کی طرف اشارہ کرتی ہے، لیکن تخفیفات اور شرائط غیر مخصوصانہ انداز میں مذکورہ ہیں۔'' (جاگیر غالب، ص: ۶۵-۶۴)

> ''اگر دستاویز اصلی ہی ہے تو یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ احمد بخش خاں نے اس کو دھوکہ سے حاصل کر لیا ہو، بالفرض اگر لارڈ لیک نے رضامندی سے بھی وہ لکھی ہو تو کیا ان کو ایسا اختیار حاصل تھا۔ میرے خیال میں خواہ یہ دستاویز اصلی ہو یا جعلی، ظاہر یہی ہوتا ہے کہ نصر اللہ بیگ خاں کے اقربا زیادہ وظیفے کے حق دار ہیں۔''
>
> (جاگیر غالب ص: ۷۰)

خلیق انجم نے لکھا ہے اب تک کے مقدمے میں یہ پہلی ایسی رپورٹ تھی جس میں غالب کے دعوے کی حمایت کی گئی تھی اور نواب احمد بخش پر انگلی اٹھائی گئی تھی۔ لیکن اس کا فائدہ غالب کو نہیں مل پایا اس لیے اس سے پہلی ہی جان میلکم نے اس دستاویز کے اصلی ہونے کی تصدیق کر دی تھی۔

۳۱ دسمبر ۱۸۳۰ء کو جارج سائمن معتمد اعلا حکومت ہند نے دہلی کے ریذیڈنٹ مارٹن کوسی کے خط کی نقل بھیجتے ہوئے لکھا کہ:

> ''نورس کا خط پڑھنے سے آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ مدعی (غالب) نے لارڈ لیک صاحب بہادر کے دستخط اور مہر سے جاری ہونے والے جس پروانے یا مراسلے کو جعلی قرار دیا ہے اس کو جناب سر جان میلکم نے صحیح دستاویز تسلیم کیا ہے۔''

> ''جنرل لارڈ لیک بہادر جنگ سپہ سالار نے ان (نواب احمد بخش خاں) کی خیر اندیشی اور جانفشانی کے پیش نظر محالات فیروز پور جھرکہ .... مع مال اور تمام بندوبست سوائے ان باغات جاگیروں درختوں اور ذاتی چیزوں کے جو کہ قدیم سے مقرر ہیں ہمیشہ کے لیے بخش دیے ہیں بشرطیکہ وہ ان کو اچھی حالت میں رکھیں اور کسی قسم کی معاونت طلب کریں اور خواجہ حاجی وغیرہ جو کہ مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے متوسلین ہیں کہ پرورش و پرداخت کریں اور کمپنی سرکار کی خیر اندیشی اور جانفشانی سے خدمت کریں، بوقت ضرورت اور حسب الطلب پچاس سوار سرکار میں حاضر کریں۔''
>
> (حیات غالب کا ایک باب، ص: ۱۹)

۷ جون ۱۸۰۶ء کی لارڈ لیک کی سند میں لکھا ہے کہ:

> محالات فیروز پور جھر کہ .... معمولہ صوبہ دار الخلافت شاہجہان کے مال اور مستقبل کے کار ہائے ضروری کے متصدی قانون گو، چودھری، مقدم، زمیندار اور مزارع جان لیں کہ متذکرہ محالات مع مال وتمام انتظام سوائے باغات املاک جاگیر اور معافی وغیرہ کہ قدیم سے مقرر ہیں۔ .... گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ نے اپنے دستخط اور مہر سے نواب احمد بخش خان بہادر مع فرزنداں کے لیے نسلاً بعد نسلاً انگریز بہادر کی سرکار کی دولت خواہی کے لیے مقرر کر دیے ہیں۔ چنانچہ سرکار ممدوح کو محالات مرقومہ سے کوئی سروکار نہ ہوگا، کیوں کہ نواب موصوف کو ان محالات کا مستقل مالک بنا دیا گیا ہے۔ وہ ان کی اطاعت اور فرمانبرداری میں حاضر رہیں اور مالیہ ادا کرتے رہیں۔“

(حیات غالبؔ کا ایک باب، ص: ۲۰)

مذکورہ بالا دونوں سندوں میں کتنی رقم پنشن میں دی جائے گی اس کا ذکر ہی نہیں ہے۔ البتہ گورنر جنرل کی سند میں خواجہ حاجی کا نام صراحتاً موجود ہے۔ اس کی بنیاد پر ملک اختر حسین کا خیال ہے کہ غالب کی نظر سے لارڈ لیک کی درخواست گزری ہی نہیں تھی۔ انہوں نے اس کے بارے میں کسی سے سن رکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب پنشن کی طویل پیروی اور بار بار افسران کی جانب سے لارڈ لیک کی سند کو اصلی قرار دینے کی وجہ سے جھنجھلاہٹ کا شکار ہو گئے تھے۔ اب غالب نے نتیجے کی پروا کیے بغیر سرکاری افسران پر رشوت خوری اور لارڈ لیک پر سرکاری کاموں میں لاپرواہی کا الزام لگا دیا۔ غالب نے گورنر جنرل ولیم بنٹنک کے نام ایک درخواست میں لکھا کہ:

> ”اس سند پر لگی ہوئی مہر اور دستخط سب جعلی ہیں اور دوسرے یہ کہ یہ سند مرحوم نواب احمد بخش خاں نے اپنی رہائش گاہ پر تیار کی اور لکھوائی اور عملے کو رشوت دے کر اس زمانے میں جب لارڈ لیک صاحب بہادر دوسرے اہم معاملات میں بہت الجھے ہوئے تھے، اس دستاویز کو فارسی زبان کی دوسری ڈھیروں دستاویزات اور کاغذات میں رکھ کر جو روزانہ دستخط کے لیے ان کے سامنے گزاری جاتی ہیں یہ درخواست بھی پیش کروائی۔ اس پر دستخط حاصل کر لیے۔ اور یہ اپنی نوعیت کا بدترین فریب اور انتہائی گھٹیا اور خطرناک جعل سازی تھی۔“

(غالب کا سفر کلکتہ، خلیق انجم، ص: ۱۱۸)

ممکن ہے کہ حقیقت میں ایسا ہوا ہو، لیکن غالب کی اس درخواست کے بعد وہ افسران بھی غالب کے مخالف ہو گئے جو ان کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ایف ہاکنس قائم مقام ریزیڈنٹ دہلی جو غالب کے ساتھ ہمدردانہ

برتاؤ کرتے تھے انہوں نے اپنے رپورٹ میں لکھا:

> ''نواب صاحب (شمس الدین احمد خاں) نے مطلوبہ خط جو فارسی میں لکھا ہوا ہے اور جس پر لارڈ لیک بہادر کی مہر اور دستخط ثبت ہیں، مجھے ارسال کر دیا ہے اور اسے پیش کرتے ہوئے مجھے امید ہے کہ اس طرح یقین ہو جائے گا جس طرح مجھے گزشتہ مئی میں اُس وقت یقین ہو گیا تھا جب میں نے اسے دیکھا تھا اور میں نے اسد اللہ خاں کے دعوے میں رپورٹ دی تھی اور اس شخص کے جھوٹے دعوے کو تسلیم کرنے کی اذیت میں مبتلا نہیں ہو گی جس نے نہ صرف حکومت کو بلکہ آپ کو اور مجھے بہت پریشان کیا اور نواب (شمس الدین) کی دل شکنی کی۔ اب وہ شخص سزا سے نہیں بچ سکے گا۔''

(غالب کا سفر کلکتہ، خلیق انجم، ص: ۱۱۹)

جارج سوئٹن جنہوں نے غالبؔ کے حق میں رپورٹ دی تھی انہوں نے بھی ۳۱ دسمبر ۱۸۳۰ء کے اپنے ایک خط میں لکھا:

> ''حضور والا گورنر جنرل نصر اللہ خاں کے متوسلین کی مالی امداد کے ضمن میں فیروز پور کے جاگیردار کے کیے ہوئے انتظام و انصرام میں مداخلت پسند نہیں فرمائیں گے۔''

(غالب کا سفر کلکتہ، خلیق انجم، ص: ۱۱۹)

یکم مئی کو گورنر جنرل کے حکم پر ان کے معتمد میکنا ئن نے غالبؔ کو لکھا کہ گورنر جنرل صاحب فضیلت مآب نائب صدران کونسل کے خیالات سے کلی طور پر اتفاق فرماتے ہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں نواب شمس الدین خاں سے موجودہ پنشن میں اضافے کا مطالبہ سراسر ناروا ہے اور جنرل لارڈ لیک صاحب کی عطا کردہ سند جس میں مختلف حصے داروں کے نام مخصوص رقم کا اندراج ہے، بالکل صحیح ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ پنشن میں اضافہ کا دروازہ حکومت کی طرف سے بند کر دیا گیا، لیکن پھر بھی غالب کہاں ماننے والے تھے۔ جب نواب شمس الدین خاں کو ۱۱۹ کتوبر ۱۸۳۵ء کو ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں پھانسی دے دی گئی اور ان کی جائداد بحق سرکار ضبط کر لی گئی، تو غالب کو یہاں امید کی ایک کرن نظر آئی۔ ٹی۔ٹی مٹکاف کے سامنے نواب صاحب کے قرض خواہوں کی درخواستیں پیش کی جانے لگیں، تو غالبؔ نے بھی آگرے کے گورنر ولیم بلنٹ کے سامنے اپنی درخواست پیش کی، جس میں انہوں نے ایک نیا مطالبہ جوڑ دیا۔ انہوں نے لکھا کہ حکومت نے غالب اور ان کے متعلقین کے لیے دس ہزار کی پنشن منظور کی تھی لیکن انہیں صرف تین ہزار سالانہ ہی ملتی رہی۔ چنانچہ ۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۵ء تک ساتھ ہزار سالانہ کے حساب سے بقایا جو دو لاکھ تین ہزار ہوتا ہے نواب

شمس الدین کی جائداد سے انہیں ادا کیے جائیں۔ جب یہ درخواست مٹکاف کے سامنے آئی تو اس نے اس کو رد کر دیا۔ آخری کوشش کے طور پر غالب نے ایک درخواست ملکہ برطانیہ کو بھی بھجوائی، لیکن اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کے بعد غالبؔ کی پنشن کچھ دنوں کے لیے بند کر دی گئی، جس کے لیے غالب کو پھر سے جدوجہد کرنا پڑا۔ تین سال بعد یہ پنشن بحال ہوئی، لیکن وہی ڈیڑھ ہزار سالانہ والی پنشن بحال ہوئی جو انہیں پہلے ملتی رہی تھی۔ غالب کے پنشن کے قضیے کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ غالبؔ جب پنشن کے سلسلے میں کلکتے گئے تو انہوں نے دوسالوں تک پنشن نہیں لی۔ غالب کی بیوی نے حکومت کے پاس درخواست جمع کرائی کہ ان کے شوہر کے بقایا جات میں سے انہیں بھی رقم دلائی جائے۔ جب اس سلسلے میں غالب سے پوچھا گیا کہ وہ کتنی رقم اپنی بیوی کو دیں گے تو انہوں نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو چار سو روپے سالانہ دینے کا ارادہ کیا ہے، لیکن پچھلے پانچ سالوں سے وہ انہیں کچھ نہیں دے پائے ہیں۔

غالبؔ کے پنشن کے پورے قضیے کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے غالبؔ کے دعوے میں کچھ صداقت ہے، لیکن سرکاری دستاویز ان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، اس وجہ سے بعد کے انگریز افسران جو غالب کے خیر خواہ بھی تھے ان کے حق میں کچھ نہیں کر سکے۔ اس لیے کہ ساری بحث لارڈ لیک کی سند کے اصلی یا فرضی ہونے کے گرد گھوم کر رہ جاتی تھی اور اس کی تصدیق پہلے ہی چکی تھی کہ سند پر موجود دستخط لارڈ لیک ہی کے ہیں۔

20.3.6 ماحصل

عزیز طلبا! مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ غالب کے پنشن کے قضیہ کافی پیچیدہ ہے۔ غالبؔ اگرچہ پنشن کی رقم بڑھوانے میں کامیاب نہیں ہوئے، لیکن اسی بہانے انہوں نے دہلی سے باہر کا ایک طویل سفر طئے کیا۔ اپنے وقت کے ہندوستان کے سب سے ترقی یافتہ شہر کو دیکھا۔ وہاں کے لوگوں سے ملے۔ اس سے ان کی شاعری اور فکر پر بھی گہرا اثر پڑا۔ یہ ان کے سفر کلکتہ کی دین تھی کہ انہوں سرسید کی کتاب کے دیباچہ پر انہوں فرسودہ موضوعات چھوڑ کر نئے موضوعات پر کام کرنے کو کہا۔ الطاف حسین حالی نے لکھا ہے کہ انہوں نے انگریزی سرکار میں پانچ مطالبے کیے تھے۔ پہلی یہ کہ سرکار نے جو پنشن ان کے لیے مقرر کی ہے وہ ان کو مکمل ملے۔ دوسری یہ کہ اب تک جو رقم ان کو کم ملتی رہی ہے اس کے بقایا جات ریاست فیروز پور سے دلوائی جائے۔ یہ دونوں درخواستیں نامنظور ہوئیں۔ تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ کل پنشن میں سے میرا جو حصہ قرار پائے وہ سرکار سے علاحدہ کر دیا جائے۔ چوتھی یہ کہ پنشن فیروز پور سے خزانہ سرکار میں جمع ہو جائے تا کہ رئیس فیروز پور سے مانگنی نہ پڑے۔ یہ دونوں درخواستیں منظور کر لی گئیں۔ آخری درخواست خطاب اور خلعت کی ہے، جو انہیں انگریزی سرکار کی طرف سے نہیں ملی۔

20.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- غالب کی پنشن کے قضیہ کی مبادیات کو جانا۔
- پنشن سے متعلق غالب کی ابتدائی کاوشوں کو جانا۔
- فریق مخالف کی جانب سے دیے گئے جواب کی حقیقت کو جانا۔
- غالب کی پنشن سے متعلق حکمران وقت کی منشا اور ان کے احکام کو جانا۔
- مقدمے کی پیروی میں غالب نے جن اقدام اور اسفار کے مراحل طئے کیے، اسے جانا۔

20.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ غالب کو پنشن ملنے کے اسباب کیا تھے؟ وضاحت کیجیے۔

۲۔ پنشن سے متعلق غالب کی کیا شکایتیں تھیں؟ مختصراً تحریر کیجیے۔

۳۔ غالب کے سفر کلکتہ کے متعلق اپنی معلومات کو مختصراً بیان کیجیے۔

۴۔ غالب نے کلکتہ پہنچ کر ۲۸ مئی ۱۸۲۸ء کو سرکار کے پاس دی گئی درخواست میں کیا بیان کیا؟ واضح کیجیے۔

۵۔ دلبرداشتہ ہو کر غالب نے درخواست میں کیا تحریر کیا؟ بیان کیجیے۔

20.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ چچا نصر اللہ بیگ آگرہ قلعہ کے قلعہ دار تھے۔ جب انگریزوں نے لارڈ لیک کی سربراہی میں آگرہ کی طرف پیش قدمی کی تو نصر اللہ بیگ نے قلعہ انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اس سے خوش ہو کر انگریزوں نے ان کو عہدے پر برقرار رکھا۔ بعد میں اس کی پاداش میں ''سونک'' اور ''سونسا'' نام کے دو پرگنے انہیں دیے گئے۔ نصر اللہ بیگ کی بیوی اور بچے کا انتقال ان کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا، اس لیے نصر اللہ بیگ کے انتقال کے بعد انگریزی سرکار نے ان کی جاگیر ضبط کر کے ان کے ورثا کے لیے پنشن مقرر کر دی۔ غالب چوں کہ نصر اللہ بیگ کے بھتیجے تھے، اس وجہ سے انہیں بھی ڈیڑھ ہزار سالانہ پنشن ملتی تھی۔

۲۔ پنشن سے متعلق بنیادی طور پر غالب کی دو شکایتیں تھیں۔ پہلی یہ کہ ان کے مطابق سرکار نے نصر اللہ بیگ کے ورثا کے لیے دس ہزار سالانہ پنشن کی رقم مقرر کی گئی تھی۔ لیکن جائداد کے منتظم نواب احمد بخش

انہیں صرف پانچ ہزار کی رقم ہی دے رہے تھے، جو غالب کے مطابق غلط تھی۔ دوسری یہ کہ نواب احمد بخش نے نصر اللہ بیگ کے ایک ملازم خواجہ حاجی کو بھی ان کے ورثا میں شامل کر کے ان کا بھی وظیفہ مقرر کر رکھا تھا، جس کی وجہ سے غالب شاکی تھے کہ پنشن میں خواجہ حاجی کی شمولیت کے باعث نصر اللہ بیگ کے حقیقی ورثا کا حق مارا جا رہا ہے۔

۳۔ پنشن کے حوالے سے غالبؔ جب نواب احمد بخش سے ناامید ہو گئے تو انھوں نے انگریز سرکار کے سامنے اپنا معاملہ خود رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ان کو معلوم ہوا کہ گورنر جنرل صاحب کانپور کے راستے دہلی آ رہے ہیں اور ان کے استقبال کے لیے دہلی کے ریزیڈنٹ مٹکاف کانپور جانے والے ہیں۔ تو انھوں نے اس امید پر کانپور کا سفر کیا کہ مٹکاف سے وہاں پر یا دہلی واپسی کے وقت راستے میں ملاقات کا موقع مل جائے گا۔ غالبؔ کانپور پہنچ کر بیمار ہو گئے اس وجہ سے ان کی ملاقات مٹکاف سے نہ ہو سکی۔ علاج کی غرض سے وہ لکھنؤ گئے جہاں وہ تقریباً پانچ مہینے رہے۔ اس کے بعد باندہ میں گئے، کیوں کہ وہاں کے نواب صاحب سے ان کے پرانے تعلقات تھے۔ نواب کی تیمارداری اور علاج سے وہ مکمل صحت یاب ہو گئے تو انہوں نے دہلی واپس جا کر قرض خواہوں کا سامنا کرنے کے بجائے کلکتہ جا کر سرکار عالیہ میں درخواست دینا مناسب سمجھا۔ اس غرض کے لیے نواب باندہ سے غالب نے پیسوں کی درخواست کی، تو انھوں نے دو ہزار روپئے کا انتظام کرا دیا۔ غالبؔ الہٰ آباد، بنارس، مرشد آباد ہوتے ہوئے خشکی کے راستے سے ۱۹فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے۔ یہ سفر انہوں نے گھوڑے سے طے کیا۔ راستے میں ان کے ساتھ تین ملازم بھی تھے۔ غالب کلکتہ میں ڈیڑھ سال تک مقیم رہے۔ جب غالب کو معلوم ہوا کہ گورنر جنرل دہلی جا رہے ہیں، تو وہ ۱۴اگست ۱۸۲۹ء کو کشتی کے راستے سے دہلی واپس چلے آئے۔

۴۔ ۲۸مئی ۱۸۲۸ء کو دی گئی درخواست میں انھوں نے اول اپنی پنشن کے لیے نواب احمد بخش سے جو درخواستیں کی تھیں اس کی روداد بیان کی۔ اس کے بعد وہ اپنے مطالبات کا بیان کرتے ہوئے لکھا کہ خواجہ حاجی کا تعلق نصر اللہ بیگ کے خاندان سے نہیں ہے۔ وہ نصر اللہ بیگ خان کے گھرانے کا ایک ملازم تھا۔ اس نے نصر اللہ بیگ کے سارے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا اور ستاسی سواروں، ایک ہاتھی اور اسباب حرب کے ساتھ نصر اللہ بیگ کے سسر نواب احمد بخش خاں سے جا ملا۔ مزید یہ بھی لکھا کہ سوائے اس کہ خواجہ حاجی کی والدہ نصر اللہ بیگ خاں کی ماں کی بہن یعنی خالہ کی بیٹی تھیں، ان میں اور نصر اللہ بیگ میں کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اس لیے ان کو دیا جانے والا وظیفہ نصر اللہ بیگ کے حقیقی وارثین کے ساتھ ناانصافی ہے۔

5۔ دلبرداشتہ ہو کر غالب نے لکھا کہ ''میرا ارادہ ہے کہ اگر حکومت نے میرے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کی

تلافی کردی اور میرے دعووں کی شنوائی کی تو بامراد و مطمئن اپنے گھر چلا جاؤں گا۔ اور آرام سے زندگی بسر کروں گا اور اپنے غریب بھائی کے معالجے کی کوشش کروں گا اور اگر ارباب حکومت میرے مقدمہ میں تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کریں گے، تو میں یہاں سے جدھر منہ اٹھے گا چلا جاؤں گا۔ اپنے لباس کو تار تار کردوں گا اور خاک چھانتا عرب اور دوسرے ممالک کے اجنبی شہروں میں ساری زندگی بھیک مانگ کر گزار دوں گا، کیوں کہ اس اعزاز کے ساتھ کہ حکومت سے میرے مراسم بڑے اچھے ہیں۔ میں ہندوستان میں کسی کے در پر بھیک مانگنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

20.7 فرہنگ

(الفاظ)	(معنی)
پس ماندگان	ورثا، آل اولاد، لواحقین
پنشن	وظیفہ
جاگیر	گاؤں یا علاقہ جو سرکار خدمت کے عوض کسی کو دے
حف	دعائیہ کلمہ، چشم بد دور
متصدی	ذمے دار، حساب کتاب دیکھنے والا
متوسلین	متعلقین میں شامل افراد، منحصر اشخاص
محالات	جاگیریں
مطرا	تازہ، شاداب
دستاویز	وہ کاغذ جو دو یا دو سے زیادہ شخصوں کے مابین کسی معاملہ میں بطور سند لکھا جائے
دل برداشتہ	بے زار، اکتایا ہوا، جس کا دل کسی کام سے اچاٹ ہو
تعلقات	جاگیر، مالیت
خلعت	عطیہ، انعام
برآوری	امید پوری ہونا
معتمد	سیکرٹری، قابل اعتبار
مختار نامہ	وہ تحریر یا دستاویز جس کے ذریعے سے کسی شخص کو مختار بنایا گیا ہو
تشخیص	پہچان، پرکھ، تصفیہ
عرض داشت	عرضی، درخواست، گزارش

حسب الطلب	چاہنے کے مطابق، خواہش کے مطابق
مالیہ	محاصل، لگان

20.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ یادگار غالب : الطاف حسین حالی

۲۔ حیات غالبؔ کا ایک باب (تحقیق کی روشنی میں) : ملک حسن اختر

۳۔ غالبؔ احوال و آثار : حنیف نقوی

۴۔ جاگیر غالب : پرتھوی چندر

۵۔ غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتہ کا ادبی معرکہ : خلیق انجم

اکائی 21 غالبؔ کے ادبی معرکے

ساخت

21.1 اغراض ومقاصد
21.2 تمہید
21.3 غالبؔ کے ادبی معرکے
  21.3.1 ادبی معرکے کا مفہوم اور اقسام
  21.3.2 ادبی معرکوں کے اسباب وعلل
  21.3.3 غالب کے ادبی معرکے
  21.3.4 ماحصل
21.4 آپ نے کیا سیکھا؟
21.5 اپنا امتحان خود لیجیے
21.6 سوالوں کے جوابات
21.7 فرہنگ
21.8 کتب برائے مطالعہ

21.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- ادبی مقابلے، ادبی مباحثے اور ادبی معرکے کے مابین افتراقی پہلوؤں سے واقف ہوں گے۔
- ادبی معرکوں کے مفہوم اقسام اور ان کے اسباب وعوامل سے متعارف ہوں گے۔
- غالبؔ کے ادبی معرکوں کے بنیادی محرکات سے روشناس ہوں گے۔
- کلکتہ اور قاطع برہان جیسے اہم ادبی معرکوں سے متعارف ہوں گے۔
- غالب کے ادبی معرکوں کی اہمیت وافادیت اور معنویت سے واقف ہوں گے۔

21.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائی میں آپ نے غالب کی پنشن کے قضیہ کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ جس میں آپ نے جانا کہ غالب کو اپنی پنشن کے متعلق حکومت سے کیا شکایات اور مطالبات تھے۔ پنشن کی بحالی اور اضافے کے لیے انھوں نے کس قدر پیروی میں مشقتیں اٹھائیں اور کن مراحل سے انہیں گزرنا پڑا، لیکن اس کے باوجود بھی انہیں کامیابی نہیں ملی۔ اب آپ زیر نظر اکائی میں غالب کے ادبی معرکوں کا مطالعہ کریں گے۔ عزیز طلبا! ادبی معرکہ آرائی کو شمالی ہند کے تناظر میں دیکھا جائے تو فارسی شعروادب کے تعلق سے شیخ علی حزیں اور خان آرزو کے درمیان معرکے اردو کے ابتدائی معرکوں سے پیوستہ ہیں۔ ان میں نہ کوئی زمانی بعد ہے اور نہ ہی کوئی انقطاع۔ ایرانی فارسی گویوں اور شعرائے سبک ہندی کے معرکوں نے اس تعلق سے ان کی رہنمائی کی۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ادبی معرکے شاعروں اور ادیبوں کے محض نجی جھگڑے نہیں ہیں۔ اگر چہ ادبی معرکے اکثر نجی حملوں اور ذاتیات پر رکیک فقروں میں تبدیل ہوجاتے تھے لیکن ان میں موجود ادبی ولسانی مباحث شاعروادیب کی ذات پر حملوں سے زیادہ لائق توجہ اور قیمتی ہیں۔ غالب کے ادبی معرکے بھی پر متعدد جہتوں سے قابل قدر ہیں، جس کا اندازہ آپ کو بہ خوبی دوران مطالعہ ہوگا۔

21.3 غالبؔ کے ادبی معرکے

21.3.1 ادبی معرکے کا مفہوم اور اقسام

آپ نے عرب کے دو بازاروں ''عکاظ'' اور ''ذوالمجاز'' کا نام ضرور سنا ہوگا۔ ان بازاروں کی خاص بات یہ تھی کہ ان میں گردونواح کے کاریگروں، ماہرین اور تاجر پیشہ افراد کے ساتھ ساتھ مشہور شعرا بھی شریک ہوتے تھے اور فی البدیہہ اشعار سناتے تھے۔ یہ اشعار دیگر موضوعات کے علاوہ کسی قبیلے کے سردار یا بڑے آدمی کی مدح میں بھی ہوتے تھے۔ اپنے مدحیہ اشعار کی بدولت یہ شعرا خاصا انعام واکرام حاصل کرلیتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ شعرا کا مقصد محض مالی منفعت ہوتا تھا بلکہ اپنی استادی اور زور بیان کا سکہ بٹھانا بھی ان کے پیش نظر ہوا کرتا تھا۔ استادی کی دھاک جمانا دراصل دوسرے ہم عصر شعرا پر فوقیت حاصل کرنے کا جذبہ ہے۔ ان بازاروں میں مختلف شعرا ایک دوسرے کے مقابلے میں اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے اور حکم ان کی تخلیقات پر فیصلہ سناتے تھے۔ جس شاعر کے حق میں حکم نے فیصلہ کردیا وہ عرب کا بڑا شاعر تسلیم کرلیا جاتا تھا۔ عربی ادب کی تاریخ میں ایسے کئی فیصلے رقم ہیں۔ ان مقابلوں کو ادبی مقابلہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ دھیان رہے کہ بسا اوقات ایسے مقابلے ادبی معرکوں کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتے ہیں۔

ادبی معرکے کے تعلق سے ایک اور صورت حال کا ذکر ضروری ہے۔ آپ نے متعدد سمینار، سمپوزیم اور بحث و مباحثہ کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ ان میں فریقین ایک متعینہ موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں اور موضوع تمام ابعاد اور مختلف پہلوؤں پر بحث ومباحثے کے ذریعے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی فریقین ایک دوسرے

سے متفق ہوجاتے ہیں اور کبھی ان کے درمیان اختلاف بہ دستور قائم رہتا ہے۔ یہ صورت حال ''ادبی مباحثہ'' کہلاتی ہے۔ لیکن اختلاف بدستور قائم رہنے کی صورت میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ فریقین کے درمیان اختلاف رائے کا اظہار اور جوابی تحریریں رسائل واخبارات کی زینت بنتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بسا اوقات ادبی مباحثے بھی ادبی معرکوں کا سبب ہوتے ہیں۔ اخبارات ورسائل سے ادبی معرکوں کی شروعات براہِ راست بھی ہوتی ہے۔

ادبی مقابلے اور ادبی مباحثے کے نتیجے میں مخصوص ادبی موضوعات ومسائل کے مختلف ابعاد سامنے آتے ہیں اور امکان کی نئی راہیں روشن ہوتی ہیں۔ یہی فوائد ادبی معرکوں سے بھی حاصل ہوتے ہیں لیکن ادبی معرکے اختلاف رائے میں شدت، مسابقت، مخاصمت، عیب جوئی اور طعنہ زنی کو بھی راہ ملتی ہے۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ جذبۂ مسابقت اور رقابت ومخاصمت نے ٹکراؤ کی ایسی صورت پیدا کردی کہ معرکے جنگ وجدل کا نمونہ نظر آنے لگے۔ تاریخ میں موجود متشدد رویوں کو ظاہر کرنے والی روایتوں میں کچھ دخل بیان کے چٹخارے اور رنگینی عبارت کا بھی ہے۔ لیکن ایسی صورت حال کے اثبات سے مفر نہیں۔ کیوں کہ بعض شعرانے شدید اختلاف سے پیدا شدہ معرکوں پر شعرا کے رویوں کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ مثال کے طور پر مرزا محمد رفیع سودا کہتے ہیں:

یک دگر ہوتا ہی ہے سقم سخن پر اعتراض
اس پہ کیا لازم جو کیجے ہو گریباں گیر جنگ
ایک ان میں سے لگا سوداؔ کے آگے پڑھنے شعر
واسطے اتنے کہ تا کیجے بہ ایں تزویر جنگ
سن کے یہ بولا خدا کے واسطے رکھیے معاف
میں تو ہوں شاعر غریب اور آپ ہیں شمشیر جنگ

اپنی نوعیت کے اعتبار سے ادبی معرکے چار طرح کے ہوتے ہیں۔ پہلی نوعیت تو یہ ہے کہ دونوں فریق سرگرم عمل رہتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے کلام کی تنقیص وتعریض کرنے کے ساتھ ساتھ معترضین کے اعتراضات کا جواب بھی دیتے ہیں۔ دوسری نوعیت میں ایک فریق دوسرے فریق پر اعتراضات وایرادات کرتا ہے اور دوسرا فریق ان پر خاموش نظر آتا ہے۔ اس صورت میں بھی دو امکان ہیں۔ ایک امکان تو یہ ہے کہ دوسرا فریق پہلے فریق کے اعتراضات کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا اور خاموش رہتا ہے یا پھر وہ پہلے فریق کے ایرادات اور اعتراضات کی تاب نہ لاکر سکوت اختیار کرتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ دوسرے فریق نے بھی اپنی مدافعت میں جوابی کاروائی کی لیکن وہ دست برد زمانہ ہوگئی اور اس سبب سے ہم دوسرے فریق کے جوابی حملے سے ناواقف ہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی شاعر نے معاصرین میں خود کو ممتاز اور قادر الکلام ثابت کرنے کے لیے

اپنے سے پہلے کے کسی مشہور اور استاد زمانہ شاعر کے کلام پر اعتراضات وارد کیے۔ اس کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے وہ استاد شاعر اب اس دنیا میں موجود نہیں، لیکن اس کے شاگردوں اور حامیوں نے ان اعتراضات کا مقابلہ کیا اور معاصر معترض شاعر پر جوابی حملے کیے۔ یہ ادبی معرکے کی تیسری صورت ہے۔ کلاسیکی دور میں طرحی مشاعروں کا خاصا چلن تھا۔ ان طرحی مشاعروں میں جہاں بہت سے شعرا اپنا کلام مصرع طرح پر وضع کر کے مشاعرے میں سناتے تھے وہیں اپنے دور کے ایسے مسلم الثبوت استاد شعرا بھی اپنا کلام لے کر جاتے تھے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک دوسرے سے بڑھ کر کمال فن کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کوشش میں اساتذہ کے درمیان ایک قسم کی خاموش جنگ جاری رہتی تھی۔ اس صورت کو ادبی معرکے کی چوتھی نوعیت کہا جاتا ہے۔ فنی اور لسانی نقطۂ نظر سے پہلی اور تیسری نوعیت کے ادبی معرکوں کو مکمل ادبی معرکہ کہہ سکتے ہیں کیوں کہ ان دونوں صورتوں میں زبان، بیان، شعریات اور مخصوص ادبی صنف سے تعلق رکھنے والی رسومیات و تہذیبی تصورات پر ایسی ایسی باریکیاں اور دقیق نکتوں کی وضاحت و صراحت ہوتی ہے کہ بدمزگی کے باوجود معرکوں کی افادیت غالب ہوتی ہے۔ اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعرا کے درمیان خود برتر، دوسروں سے ممتاز اور قادر الکلام ثابت کرنے کے لیے معرکے وجود میں آتے تھے جو کبھی کبھار شدت اختیار لیتے اور ذاتی حملوں اور بغض وعناد نیز مخاصمت میں متشکل ہوتے تھے۔

21.3.2 ادبی معرکوں کے اسباب و علل

ذیل میں ادبی معرکوں کے اسباب و عوامل کے اہم نکات کی نشاندہی اختصار کے ساتھ کی جاتی ہے:

۱۔ درباری سرپرستی

۲۔ استادی اور شاگردی کا ادارہ

۳۔ علاقائی تعصب: ایرانی اور ہندوستانی شعرائے فارسی، دہلی اور لکھنؤ کی مسابقت

۴۔ تذکرہ نگاری: گروہ بندی، علاقائی تعصب، معاصرانہ چشمک، استاد اور اس کے احباب نیز اپنے استاد بھائیوں کی

بے جا ستائش۔

۵۔ شاعر کا اپنا مزاج: بدمزاجی اور رعونت

۶۔ تعلّی کے ذریعے معاصرین پر برتری کا اظہار (مثال کے طور پر میر کی مثنوی ''اژدرنامہ'')

۷۔ حسب و نسب پر بے جا تفاخر

۸۔ حد درجہ بذلہ سنجی اور ہنسی ٹھٹھول

۹۔ توارد کو سرقہ گمان کر کے معترض ہونا

۱۰۔ مقابلہ آرائی کی غرض سے کسی دوسرے شاعر کے رنگ میں جوابی غزل کہنا

اوپر درج تمام محرکات پر شرح و بسط کے ساتھ گفتگو ضروری تھی تاکہ ادبی معرکے کے مفہوم اور اسباب و محرکات سے آپ باخبر ہو جائیں اور ''غالب کے ادبی معرکوں'' کے مطالعے کے دوران آپ اس سے ہونے والے ادبی اور لسانی فوائد کو اخذ کر سکیں۔ ساتھ ہی یہ اندازہ بھی لگا سکیں کہ غالب کے مختلف معرکوں کے پیچھے کون سے محرکات کارفرما تھے۔

21.3.3 غالب کے ادبی معرکے

بقول مالک رام مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی پوری زندگی معرکوں کی ایک مسلسل داستان ہے۔ انھوں نے مرزا غالب کے معرکوں کی درجہ بندی بھی کی ہے۔ غالب کے معرکوں میں خاندانی معرکے، مالی معرکے، جذباتی معرکے اور ادبی معرکے شامل ہیں۔ غالب کے ادبی معرکے ان کی پوری زندگی کو محیط ہیں۔ اس اکائی میں غالب کے ادبی معرکوں سے واقفیت مقصود ہے لہٰذا یہاں ہم ان کے ادبی معرکوں کا قدرے تفصیل سے ذکر کریں گے۔

مولوی محمد معظم:

غالب کی زندگی کا پہلا ادبی معرکہ مولوی محمد معظم سے ان کی چپقلش ہے۔ مولوی محمد معظم، غالب کے مکتب کے استاد تھے۔ مولانا حالی ''یادگار غالب'' میں بیان کرتے ہیں کہ غالب نے گیارہ برس کی عمر سے ہی شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا اور اسی زمانے میں فارسی میں بھی فکر سخن کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ اسی ابتدائی زمانے میں غالب نے فارسی میں کچھ اشعار موزوں کیے جس کی ردیف ''کہ چہ'' تھی۔ غالب نے ''کہ چہ''، یعنی ''چہ'' کے معنی میں استعمال کیا تھا۔ انھوں نے اشعار موزوں کر کے اپنے استاد مولوی محمد معظم کی خدمت میں پیش کیا۔ استاد نے غالب کی ردیف ''کہ چہ'' کو مہمل اور اشعار کو بے معنی قرار دیا۔ ایک روز غالب کو ''کہ چہ'' کی سند ملا ظہوری کے کلام سے مل گئی اور ظہوری کا شعر استاد کو دکھایا۔ شیخ معظم سند دیکھ کر حیران ہو گئے اور مرزا غالب کی یہ کہہ کر پذیرائی کی کہ ''تم کو فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے''۔ اوائل عمری کے اس واقعے کو غالب کی استاد کے ساتھ چپقلش یا معرکہ آرائی کا نام دینا مناسب نہیں۔ شاگرد کی ذہانت اور تلاش و جستجو کو دیکھتے ہوئے استاد کا کلمۂ تحسین ادا کرنا چپقلش یا معرکہ نہیں۔ البتہ اس واقعے سے جہاں غالب کی ذہانت اندازہ ہوتا ہے وہیں معرکہ آرائی سے ان کی فطری مناسبت کا بھی احساس ہوتا ہے۔

شعرائے دہلی:

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ غالب کا خاص اسلوب مشکل پسندی اور پیچیدہ گوئی ہے۔ غالب بنیادی

طور پر ایک خیال بند شاعر تھے اور ماضی قریب کے سبک ہندی کے شعرا سے خاصے متاثر تھے۔ اس تعلق سے مرزا عبدالقادر بیدل ان کے پسندیدہ شاعر تھے اور بیدل کی طرز خاصی پیچیدہ تھی۔ گویا مرزا غالب فارسی اور اردو شاعری میں سبک ہندی کے استاد شعرا کا تتبع کرتے تھے۔ غالب نے اوائل عمری ہی سے فارسی ادبیات کا وسیع مطالعہ کیا تھا، لہٰذا فارسی اسالیب کی طرف ان کا میلان بالکل فطری تھا۔ ظاہر ہے مضمون آفرینی کوئی آسان طرز نہیں اور عجب نہیں کہ ابتدا ہی سے اس کی طرف میلان اور پیروی نے نو آموزی کے زمانے میں ناکامی ہاتھ آئی ہو۔ اس صورت میں غالب پر مہمل گوئی کا الزام لگنا بعید نہیں۔ دہلی میں غالب کی مشکلات اور مخالفت کے تعلق سے حالی نے ''یادگار غالب'' میں تین روایتیں نقل کی ہیں۔ پہلی روایت ذیل میں درج کی گئی ہے:

> ''خود مرزا کی زبانی سنا کیا ہے کہ میر تقی میر نے، جو مرزا کے ہم وطن تھے، ان کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ ''اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔''

مندرجۂ بالا اقتباس میں دو باتیں قابل غور ہیں لیکن اس سے پہلے چند امور پر توجہ دینی ضروری ہے۔ شعرائے دہلی سے غالب کی چھیڑ چھاڑ کے تعلق سے حالی کی مذکورہ روایت کو اولین واقعے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ میر کا انتقال ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ غالب ۱۸۱۳- ۱۸۱۲ میں مستقل طور پر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے اس وقت ان کی عمر پندرہ یا سولہ برس کی تھی۔ اس سے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں کہ میر کو غالب کا جو بھی کلام دکھایا گیا وہ آگرے میں کہا گیا اور اس وقت غالب کم عمر ہی تھے۔ اس واقعے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ میر تقی میر کلام غالب کی فہم سے قاصر تھے یا انھوں نے غالب کی ناقدری کی، مضحک بات ہے۔ اوپر درج اقتباس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ میر نے غالب کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا اور ان میں ایک اچھے شاعر کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میر جیسے استاد شاعری چھوڑ کر کوئی اور پیشہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتے۔ لہٰذا اس واقعے کو ایک استاد شاعر کی طرف سے نو آموز کے لیے نیک خواہشات ہی سمجھنا چاہیے۔

دوسرا واقعہ حکیم آغا جان عیش کا ہے۔ دہلی کے ایک مشاعرے میں حکیم آغا جان عیش نے اپنی ایک غزل پڑھی جس میں قطعہ بند اشعار بھی شامل تھے۔ ان قطعہ بند اشعار کے نشانے پر غالب کی زبان اور ان کا اسلوب بیان تھا۔ قطعہ ملاحظہ کیجیے:

زبان میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے

مگر اون کی زبان وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے
اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے تم کہو اور دوسرا سمجھے

مولانا الطاف حسین حالی نے تیسرا واقعہ مولوی عبدالقادر رامپوری کا بیان کیا ہے۔ مولوی عبدالقادر رامپوری ظریف الطبع آدمی تھے۔ قلعۂ معلّیٰ سے بھی ان کا تعلق رہا۔ ایک دن انھوں نے غالب سے کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آیا اور دو مصرعے فی البدیہہ موزوں کر کے مرزا غالب کو سنایا:

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

غالب نے احتجاج کیا کہ یہ شعر میرا نہیں ہے، لیکن عبدالقادر رامپوری نے اصرار کیا کہ یہ شعر میں نے آپ کی غزل میں دیکھا ہے۔ غالب سمجھ گئے کہ عبدالقادر رامپوری انھیں مہمل گو کہہ رہے ہیں۔ ان تین واقعات سے کسی قسم کی معرکہ آرائی کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ابتداً دہلی میں غالب کے اشعار کا نہ صرف مذاق اڑایا گیا بلکہ غالب کو شعرائے دہلی کی مخالفت بھی درپیش تھی، لیکن یہ مخالفت بہت شدید نہیں تھی۔ مولانا الطاف حسین حالی ''یادگار غالب'' میں لکھتے ہیں:

> ''سنا گیا ہے کہ اہل دہلی مشاعروں میں جہاں مرزا بھی ہوتے تھے تعریضاً ایسی غزلیں لکھ کر لاتے تھے، جو الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پرشوکت و شاندار معلوم ہوتی تھیں۔ مگر معنی ندارد، گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔''

درج بالا تینوں واقعات کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے ہم اسے ادبی معرکے کی دوسری قسم کہہ سکتے ہیں جس میں دوسرا فریق پہلے فریق کے ایرادات کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا اور خاموش رہتا ہے۔ دہلی میں غالب کو خفیف یا شدید کسی بھی قسم کی مخالفت کا سامنا کیوں کرنا پڑا، اس تعلق سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کو اپنی فارسی دانی اور حسب نسب پر حد درجہ ناز تھا۔ اور ہم یہ جانتے ہیں کہ کسی شاعر کا حد سے زیادہ تفاخر بھی بسا اوقات مخالفت اور معرکے کا سبب ہوتا ہے۔

کلکتے کا ادبی معرکہ:

غالب کا قیام کلکتہ اور یہاں وقوع پذیر ادبی معرکہ کئی لحاظ سے اہم ہے۔ اس کی پہلی اہمیت تو یہی ہے کہ لسانی

مباحث کے اعتبار سے یہ صحیح معنوں میں غالب کے اولین ادبی معرکے کی حیثیت رکھتا۔ اس معرکے میں پہلی دفعہ ہندوستانی فارسی گویوں، فرہنگ نویسوں اور مرزا قتیل کے بارے میں غالب کے خیالات صریح اور واضح طور پر سامنے آئے۔ اس معرکے میں مرزا غالب کی قتیل دشمنی کا اظہار ہوا جس کے سبب ایک اور معرکہ ’’قاطع برہان‘‘ کی شکل میں سامنے آیا۔

کلکتے کا ادبی معرکہ فارسی دانی میں غالب کی تعلیٰ کے سبب وجود میں آیا۔ قبل اس کے اس معرکے کی تفصیل پیش کی جائے غالب کے مزاج اور ذہن کو سمجھنا ضروری ہے۔ غالب کو اپنی فارسی دانی پر اس قدر ناز تھا کہ وہ ہندوستانی فارسی گویوں میں امیر خسرو اور اپنے علاوہ کسی کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ اس تعلق سے وہ حد درجہ خودستائی کا شکار تھے۔ فارسی کے مشہور زمانہ شاعر صائب اصفہانی کو مرزا غالب مسلم الثبوت شاعر مانتے تھے، لیکن اس کی سند محض اس لیے قبول نہیں کرتے کہ وہ وارد شاہجہاں آباد تھا۔ فیضی کی بھی ان کے نزدیک ٹھیک نکل جاتی ہے۔ ظاہر بات ہے ایسا زعم اور ایسی خودستائی اہل علم کے نزدیک مستحسن نہیں ہوسکتی تھی۔ جب غالب فارسی کے شاعر صائب اصفہانی کو محض اس وجہ سے سند نہیں مانتے کہ وہ شاہجہاں آباد وارد ہوا تھا تو وہ خود کو کیسے مستند کہہ سکتے تھے جس کی پیدائش ہی ہندوستان میں ہوئی۔ ان کی یہی خودستائی کلکتہ میں ان پر اعتراضات وایرادات کی بوچھاڑ کا سبب بنی۔

غالب ۱۸۲۵ء کے اواخر میں عازم کلکتہ ہوئے اور فروری ۱۸۲۸ء میں کلکتے پہنچے۔ اس سفر کا مقصد ان کی خاندانی پنشن کا قضیہ تھا۔ غالب چاہتے تھے کہ کلکتے میں گورنر جنرل کی کونسل کے سامنے اپنے حالات رکھیں اور دادخواہی کریں۔ اس زمانے میں کلکتے کا مدرسۂ عالیہ علم وادب کا گہوارہ تھا۔ یہاں ہر مہینے کے پہلے اتوار کو بزم سخن آراستہ ہوتی تھی۔ اسی کے ایک مشاعرے میں غالب نے اپنی ایک غزل پیش کی جس کا ایک شعر حسب ذیل ہے:

جزوے عالم از عالم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موئے کہ بتاں را زمیاں برخیزد

درج بالا شعر پر یہ اعتراض وارد ہوا کہ مصرع اولیٰ میں ’ہمہ عالم‘ کی ترکیب غلط ہے۔ ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا کہ ’’بیشم‘‘ کی جگہ ’’بیشترم‘‘ کہنا چاہیے تھا۔ تیسرا اعتراض یہ بھی کیا گیا کہ ’’موئے زمیاں‘‘ کی ترکیب بھی غلط ہے۔ اب یہ صورت پیدا ہوئی کہ غالب کا پورا مصرع ہی غلط ٹھہرا۔ اس میں پہلا اعتراض اس بنا پر کیا گیا کہ ’ہمہ‘ جمع اور ’عالم‘ واحد ہے۔ جمع اور واحد کا یہ اجتماع قتیل کے اجتہاد کی رو سے غلط ہے جائز نہیں۔ قتیل کی سند پر غالب نے اعتراض کرنے والوں کو ڈانٹ کر کہا کہ ’’کون قتیل! وہ فرید آباد کا کھتری بچہ! اساتذۂ ایران کے مقابلے میں اس کی حیثیت ہی کیا ہے کہ میں اس فرومایہ کی سند قبول کرلوں!‘‘ اس زمانے میں قتیل کے تلامذہ، معتقدین اور

مداحین کی خاصی تعداد موجود تھی۔ قتیل کے لیے غالب کے نازیبا اور تحقیر آمیز کلمات ان لوگوں کو سخت ناگوار گزرے اور ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ حالاں کہ اس بات کی بھی سند نہیں ملتی کہ قتیل کا یہ اجتہاد کس کتاب میں درج ہے۔ غالب کے دوستوں نے غالب کی طرف سے اعتراضات کے جواب اساتذۂ فن کے کلام سے بھی دیے لیکن ہنگامہ کسی طرح فرو نہ ہوا اور مشاعرہ گاہ سے نکل کر کلکتے کے کوچہ و بازار تک پہنچ گیا۔ یہ بھی قیاس لگایا جاتا ہے کہ غالب کے مخالفین نے ان کے کلام پر اعتراضات لکھ کر شائع بھی کرا دیا تھا۔ جب مخالفت کا بازار گرم ہوگیا تو غالب نے اپنے دوستوں نواب اکبر علی خان طباطبائی اور مولوی محمد محسن کے مشورے پر ''آشتی نامہ'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی جس میں کلکتہ کے علما و فضلا کی تعریف بیان کرتے ہوئے اپنی بیکسی کا ذکر کیا، لیکن قتیل کی سند کے حوالے سے اپنے موقف پر بھی ڈٹے رہے۔ یہ مثنوی غالب کی ''کلیات نظم فارسی'' میں ''باد مخالف'' کے نام سے شامل ہے۔ اسی مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی ایک دوسری فارسی غزل کے اور ایک شعر پر اعتراض کیا گیا کہ اس میں ''ردیف زدۂ بہمزہ کا استعمال غلط ہے''۔ پہلے غالب کا شعر ملاحظہ کیجیے اس کے بعد اعتراض پر غالب کا جواب سنیے:

شور اشکے بفشار بُن مژگاں دارم
طعنہ بر بے سرو سامانی طوفاں زدۂ

مندرجہ بالا شعر کے اعتراض پر غالب نے ''آشتی نامہ'' میں حسب ذیل جواب دیا ہے:

باوجودے کہ شعر من صافست
زدہ را می زند چہ انصافست
اعتراض آتشم بجاں زدہ است
شعلہ در مغز استخواں زدہ است
زدہ را کسرہ از ظرافت نیست
یای وحدت بود اضافت نیست

اس آشتی نامے کے بعد مخالفین غالب کی شدت میں کمی آ گئی۔

اس معرکے کی نوعیت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ ادبی معرکے کی پہلی صورت سے تعلق رکھتا ہے، لیکن جب اعتراض بہ سند قتیل وارد ہوا اور مرزا غالب نے قتیل کے لیے نازیبا الفاظ اور لہجۂ تحقیر اپنایا تو معرکے کی نوعیت تیسری قسم کی بھی ہوگئی، جس کے تحت اعتراض کسی فوت شدہ شاعر پر ہوا اور اس مرحوم کے حامی اور تلامذہ مقابلے

پر آ جائیں۔ اس معرکے کی علت فارسی زبان دانی پر غالب کے بے جا تفاخر ہے۔ غالب کے سپاس نامے کے سبب کلکتے کا یہ معرکہ تو فرو ہو گیا، لیکن انھوں نے قتیل کا پیچھا تا عمر نہیں چھوڑا اور اپنے خطوط میں بیسیوں جگہ دوسرے ہندوستانی فارسی گو یوں بالخصوص قتیل کی تنقیص کرتے رہے۔

قاطع برہان کا قضیہ:

غالب کی کتاب ''قاطع برہان'' ۱۸۶۲ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس میں کل ۹۷ صفحات ہیں اور صفحہ ۹۸ پر غلط نامہ ہے۔ یہ کتاب دراصل فارسی لغت کی مشہور کتاب ''برہان قاطع'' از محمد حسین تبریزی میں در آئی اغلاط کی نشاندہی کرتی ہے۔ ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو دہلی پر دیسی سپاہیوں کا قبضہ ہو گیا۔ دیسی سپاہیوں کی انتقامی کاروائی کی زد پر نہ صرف انگریز بلکہ حامیان انگریز بھی تھے۔ اسی وجہ سے غالب نے گھر سے نکلنا کم کر دیا اور فرصت کے وقت میں ''برہان قاطع'' کا مطالعہ شروع کر دیا۔ مطالعے کے دوران کتاب میں جا بجا اغلاط نظر آئیں۔ غالب نے اغلاط کے تعلق سے کتاب کے حاشیے میں اشارات لکھ لیے اور جب امن قائم ہوا تو دوستوں کے مشورے پر فارسی زبان کے طلبہ کی افادیت کے پیش نظر ان حواشی کو ''قاطع برہان'' کے نام سے فارسی زبان میں شائع کروا دیا۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی مولف ''برہان قاطع'' محمد حسین تبریزی کے معتقدین نے سخت مخالفت کی۔ مولانا حالی اس مخالفت کی وجہ لوگوں کے تقلیدی رویے کو قرار دیتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ ''مرزا کے اعتراضات برہان قاطع پر کیسے ہی صحیح اور واجب ہوتے ممکن نہ تھا کہ ان کی سختی کے ساتھ مخالفت نہ کی جاتی۔'' واقعہ یہ ہے کہ غالب جب ''برہان قاطع'' پر حاشیہ لکھ رہے تھے اس وقت انھوں نے کہیں سنجیدگی کے ساتھ معنی کی تصحیح کی اور بعض مقامات پر استہزائی انداز اختیار کرتے ہوئے لطیفہ گوئی اور چٹکلا بازی سے بھی کام لیا۔ حالی نے غالب کی اسی روش کی توجیہہ کی ہے۔ اس کے برعکس شیخ محمد اکرام کہتے ہیں کہ اگر غالب علمی بحث میں ذاتیات کو نہ لے آتے تو مخالفین اتنی سختی سے جواب نہ دیتے۔ مرزا غالب نے جہاں اختلاف کی صورت میں دلائل و براہین سے کام لیا وہیں قلم سے تیر و نشتر کا بھی کام لیا۔ غالب کے اس مزاج کا اعتراف کیے بنا مفر نہیں۔ قتیل کے لیے غالب نے جیسے نازیبا کلمات اپنے خطوط میں لکھے ہیں وہ بطور دلیل پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ قتیل کے معاملے میں اگر حامیان قتیل نے غالب کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کی بھی تھی تو اس میں قتیل کا کوئی قصور نہیں تھا۔ غالب نے قتیل کے ساتھ زیادتی کا آغاز کلکتہ سے ہی کر دیا تھا، حالاں کہ اس وقت قتیل زندہ بھی نہیں تھے۔ قتیل کا قصور بس اتنا تھا کہ کلکتہ میں حاضرین مشاعرہ نے غالب کے اشعار پر اعتراض کرتے ہوئے قتیل کی سند دے دی تھی۔ وہاں بھی غالب نے محض اعتراض کی بنا پر ہی قتیل کو ''فرید آباد کا کھتری بچہ'' کہہ کر مخاطب کیا تھا جس سے حسب نسب پر بے جا تفاخر کی بو آتی ہے۔ بہر حال کتاب کے منظر عام پر آتے ہی ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور ''قاطع برہان'' کے جواب میں سب سے پہلی کتاب ''محرق قاطع برہان'' مولفہ مولوی سید سعادت علی بہ زبان

فارسی ۱۸۶۴ء میں مطبع احمدی، شاہدرہ سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں کل ۹۶ صفحات ہیں۔

''محرق قاطع برہان'' کے جواب میں تین کتابیں منظر عام پر آئیں:

۱۔ دافع ہذیان (فارسی) از مولوی نجف علی، ۴۸ صفحات، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۵ء

۲۔ لطائف غیبی (اردو) از میاں دادخاں سیاح، ۴۱ صفحات، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۵ء

۳۔ سوالات عبدالکریم (اردو) از عبدالکریم، ۸ صفحے، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۵ء

لطائف غیبی (میاں دادخاں سیاح) اور سوالات عبدالکریم (عبدالکریم) کے بارے میں قرائن سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ دونوں کتابیں غالب نے خود لکھ کر دوستوں کے نام سے شائع کروائی ہے۔

غالب کی ''قاطع برہان'' کے جواب میں بہ زبان فارسی دوسری کتاب ''ساطع برہان'' از مرزا رحیم بیگ میرٹھی، ۱۷۴ صفحات، مطبع ہاشمی، میرٹھ، ۱۸۶۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا جواب غالب نے اپنے ایک اردو خط بنام مرزا رحیم بیگ میں دیا۔ ۱۶ صفحات پر مشتمل یہ خط ''نامۂ غالب'' کے عنوان سے ۱۸۶۵ء میں مطبع محمدی سے شائع ہوا۔ اب یہ خطوط غالب کے تمام مجموعوں میں شامل ہے۔

''قاطع برہان'' کے جواب میں ایک اور کتاب ''قاطع القاطع'' از امین الدین امین دہلوی، ۲۶۸ صفحات، مطبع مصطفائی، دہلی، ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی۔ ''قاطع برہان'' کے جواب میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے لیکن شائع بعد میں ہوئی۔ اس کتاب کی زبان لچر اور فحش ہے، غالباً اسی وجہ سے غالب نے اسے قابل اعتنا نہیں سمجھا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ بعد میں غالب نے مصنف کتاب پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ کر دیا۔ غالب دعویٰ ثابت کرنے میں ناکام ہو گئے اور ناچار مقدمہ واپس لے لیا۔

غالب کے جواب میں ۴۶۸ صفحات پر مشتمل سب سے اہم اور وقیع کتاب ''موید برہان'' شائع ہوئی۔ اس کتاب کے مصنف آغا احمد علی احمد جہانگیر نگری ہیں۔ ''موید برہان'' کی اشاعت ۱۸۶۶ء میں مطبع مظہر العجائب، کلکتہ سے عمل میں آئی۔ جب غالب کو اس کتاب کی خبر لگی تو انھوں نے فارسی زبان میں ۱۳۱ اشعار پر مشتمل ایک قطعہ لکھا جو بعد میں ''سبد چین'' میں شامل کیا گیا۔ اس قطعے کے علاوہ غالب نے ۳۲ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ''تیغ تیز'' کے نام سے لکھا، جو ۱۸۶۷ء میں اکمل المطابع، دہلی سے شائع ہوا۔ اس رسالے میں ۱۷ فصلیں ہیں۔ پہلی ۱۶ فصلوں میں ''موید برہان'' کے اعتراضات کے جواب اور اپنے اعتراض درج ہیں۔ سترھویں فصل میں غالب نے ''برہان قاطع'' پر مزید اعتراض شامل کیے۔ ''تیغ تیز'' کے آخر میں ۱۶ ادبی سوالات کا ایک استفتا بھی شامل ہے۔

مرزا غالب کے فارسی قطعہ کا جواب مولوی عبدالصمد فدا نے فارسی قطعہ لکھ کر دیا۔ غالب کی طرف سے فدا کے فارسی قطعے کا جواب فارسی قطعے ہی میں سید محمد باقر علی باقر اور سید فخرالدین حسین سخن نے دیا۔ یہ چاروں فارسی قطعے ’’ہنگامہ دل آشوب‘‘ کے نام سے جمع کر دیے گئے۔ باقر اور سخن کے قطعوں کا جواب دوبارہ مولوی عبدالصمد اور منشی جواہر سنگھ جوہر لکھنوی نے فارسی قطعہ لکھ کر دیا۔ فدا اور جوہر کے قطعوں کا جواب ایک بار پھر باقر اور سخن نے فارسی قطعہ لکھ کر دیا۔ اسی دوران ۲۵/جون ۱۸۶۷ء کے اودھ اخبار میں میر آغا علی شمس لکھنوی کا اردو میں ایک مضمون ’’ایرادات بر اشعار مرزا غالب‘‘ شائع ہوا۔ شمس لکھنوی کے ایرادات کا جواب فارسی نثر میں سید محمد باقر علی باقر اور اردو نثر میں سید فخرالدین حسین سخن نے دیا۔ علاوہ ازیں شمس لکھنوی کے جواب میں محمد امیر امیر لکھنوی نے اردو میں ایک قطعہ بھی لکھا۔ قطعہ فارسی فدا (دوم)، قطعہ فارسی باقر (دوم)، قطعہ فارسی سخن (دوم)، قطعہ فارسی جوہر، قطعہ اردو امیر، شمس لکھنوی کے اردو نثر میں غالب کے ایرادات، اس کے جواب میں باقر کی فارسی نثر اور اردو نثر میں سخن کا جواب ’’ہنگامۂ دل آشوب حصہ دوم‘‘ میں یکجا کر دیے گئے۔

اسی دوران غالب نے ’’قاطع برہان‘‘ پر مزید فوائد و اعتراضات کا اضافہ کر کے ’’درفش کاویانی‘‘ کے نام سے مطبع اکمل المطابع، دہلی سے ۱۸۶۵ء میں چھپوایا۔ یہ کتاب کل ۱۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ احمد علی احمد جہانگیر نگری مولف ’’موید برہان‘‘ نے غالب کے رسالے ’’تیغ تیز‘‘ اور قاطع برہان کے نئے ایڈیشن ’’درفش کاویانی‘‘ کا جواب ’’شمشیر تیز تر‘‘ کے نام سے شائع کی۔ کتاب پر تاریخ طباعت ۱۸۶۸ء درج ہے لیکن یہ ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے غالب کا انتقال ہو گیا۔ یہ کتاب اس معرکے کی آخری کتاب ہے۔ اس تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی ’’قاطع برہان‘‘ نے ہندوستان بھر میں ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا اور ملک کے نامور علما و فضلا نے غالب سے اختلاف اور حمایت کی شکل میں زبان اور قواعد زبان کے تعلق سے گراں قدر نکات آشکار کیے۔

غالب کے طنز و تعریض اور تند لب و لہجے کے باوجود موضوع کے اعتبار سے ’’قاطع برہان‘‘ حق پر مبنی تھی۔ ’’برہان قاطع‘‘ پر غالب کے بیشتر اعتراضات درست تھے۔ بعض مقامات پر غالب سے بھی تسامحات سرزد ہوئے۔ بعد میں اکثر تسامحات کو غالب نے قبول کیا اور رجوع بھی کیا۔ فرہنگ ناصری مرتبہ رضا قلی خان ہدایت نے کئی مقامات پر غالب سے اتفاق کیا ہے۔ فرہنگ ناصری غالب کے انتقال کے بعد ایران سے شائع ہوئی تھی۔ تبریزی کی برہان قاطع کا ایک ایڈیشن تہران سے بھی شائع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن کے مرتب محمد معین نے بھی کئی مقام پر مرزا غالب کی تائید کی ہے۔ زبان دانی پر حد درجہ تفاخر اور ناز ایک دوسری بات ہے لیکن اس تفصیل سے غالب کی فارسی دانی اور اس زبان سے ان کی فطری مناسبت کا پختہ ثبوت ملتا ہے۔

نواب کلب علی خان سے چپقلش:

مرزا غالب رامپور کے نواب یوسف علی خان متخلص بہ ناظم کے استاد تھے۔ اپریل ۱۸۶۵ء میں یوسف علی خان کا انتقال ہوگیا اور ان کی جگہ ان کے بڑے بیٹے نواب کلب علی خان والی رامپور قرار پائے۔ نواب کلب علی خان نہایت تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ اردو اور فارسی میں شعر گوئی بھی کرتے تھے۔ یوسف علی خان کے زمانے میں غالب کے لیے جاری مشاہرہ نواب کلب علی خان کے عہد میں بھی برقرار رہا۔ اگست ۱۸۶۶ء میں مولوی محمد عثمان خان نے ''قصائد بدر چاچ'' کی شرح اور اس شرح پر نواب کلب علی خان نے فارسی نثر میں تقریظ لکھی۔ نواب صاحب نے یہ تقریظ بغرض اصلاح غالب کو ارسال کی۔ غالب نے نواب صاحب کی نثر میں ایسے الفاظ پر اصلاحیں دیں جو بیشتر ہندوستانی فارسی گویوں کی نظم و نثر میں عام ہیں۔ جب یہ اصلاح نواب کلب علی خان کے پاس پہنچی تو انھوں نے غالب کو جوابی خط لکھا۔ اس جوابی خط سے غالب کو مغالطہ ہوا اور انھوں نے اپنی عادت کے مطابق جواب میں ہندوستانی فارسی گویوں کے نا قابل اعتماد ہونے کا ذکر کر دیا۔ غالب کے خط میں دو جملے ایسے تھے جو نواب صاحب کو نہایت گراں گزرے۔ وہ دونوں جملے حسب ذیل ہیں:

۱۔ ''میں تو حضرت کو اپنا استاد اور اپنا مرشد اور اپنا آقا جانتا ہوں۔'' نواب صاحب نے غالب کے اس جملے کو تعریض پر محمول کیا۔

۲۔ ''بحث کا طریق یاد نہیں۔'' نواب صاحب نے اس جملے کے متعلق یہ خیال کیا کہ مرزا غالب افہام و تفہیم کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے یہ چاہتے ہیں کہ وہ جو کہیں میں بے چوں و چرا مان لوں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے نواب صاحب نے غالب کو لکھا کہ:

> ''مکتوب حیرت اسلوب مشعر اختراع معنی غلط نسبت ہندی نژادان پیشین و دیگر اعتراضہا و ایں کہ راقم را طریقۂ بحث یاد نیست، موصول مطالعہ گشتہ، باعث استعجاب عظیم گردید، از آں جا کہ تا حال ورائے تحقیق و تنقیح امور علمیہ کہ معاذ اللہ، از مناظرہ و مناقشہ چشم حس بیں بسا بعید می نماید۔''

اس کے جواب میں غالب نے یہی لکھا کہ ہندی فرہنگ لکھنے والوں کے بیان میں جو نادرستی ہے میں ان میں کلام نہیں کرتا۔ ''اپنی تحقیق کو مانے ہوئے ہوں، اوروں سے مجھے بحث نہیں۔'' اس چشمک کے بعد نواب کلب علی خان نے پھر کبھی اپنی کوئی تحریر مرزا غالب کے پاس بغرض اصلاح نہیں بھیجی۔ ہندوستانی فارسی گویوں کو غیر مستند اور نا قابل اعتماد قرار دینے میں غالب تنہا نہیں ہیں بلکہ یہ قضیہ تو خان آرزو کے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ غالب کا

قصور یہ ہے کہ ہندوستان میں پیدا ہونے کے باوجود خود کو مستند اور مسلم الثبوت تسلیم کروانے پر مصر تھے اور ایرانی نژاد شعرا جنھوں نے زبان کو ایران میں رہ کر سیکھا، جن کا مذاق شعر بھی ایران میں پروان چڑھا، انھیں صرف اس لیے نا قابل اعتبار گردانتے تھے کہ وہ وارد ہندوستان ہوئے۔

21.3.4 ماحصل

غالب اوائل عمری ہی سے بلا کے ذہین اور فارسی ادبیات سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ وہ سبک ہندی کے مشہور فارسی گو مرزا عبدالقادر بیدل کی طرز کے حد درجہ مداح تھے۔ وہ پیروی بیدل پر ابتدا ہی سے مائل تھے۔ بیدل کے اسلوب میں غزل کہنا کوئی معمولی بات نہیں، یہ ایک پیچیدہ طرز اسلوب تھا۔ بعد میں زمانے نے دیکھا کہ غالب نے اس طرز کو ایسی خوبی سے نبھایا کہ اردو میں خیال بند اسلوب غالب سے منسوب ہو گیا۔ اسی پیچیدہ گوئی کی وجہ سے غالب پر مہمل گوئی کا الزام لگایا گیا اور قیام دہلی کے ابتدائی زمانے میں بعض دہلوی شعرا نے ان کے کلام کا مذاق بھی اڑایا۔ لیکن غالب کو اصل معرکہ کلکتے میں پیش آیا۔ جہاں انھوں نے ایک غزل پڑھی اور اس غزل کے ایک شعر پر اعتراض یہ کہہ کر کیا گیا کہ بہ سند قتیل درست نہیں۔ معترضین کی طرف سے قتیل کی سند کیے جانے پر غالب نے قتیل کے لیے نازیبا اور پر حقارت لہجہ اپنایا جو معتقدین قتیل کو نہایت گراں گذرا۔ اس معرکے کی گونج کلکتے کے گلی کوچوں تک سنائی دی۔ کلکتے کے اس معرکے کی وجہ سے غالب کے دل میں قتیل اور ہندوستانی فارسی گویوں کے لیے بے وقعتی بڑھ گئی اور تا عمر غالب ہندوستانی فارسی گویوں نا قابل اعتنا سمجھتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد غالب کی کتاب ’’قاطع برہان‘‘ شائع ہوئی۔ اس کتاب نے پورے ملک میں آگ لگا دی۔ یہ کتاب دراصل ’’برہان قاطع‘‘ از محمد حسین تبریزی کی فروگذاشتوں کی نشاندہی اور تصحیح پر مشتمل تھی۔ لیکن ہنگامے کا اصل سبب ہندوستانی فارسی گویوں کے لیے غالب کا تندوتیز اور حقارت آمیز لہجہ تھا۔ غالب کی کتاب کے جواب میں چار کتابیں محرق قاطع برہان، ساطع برہان، قاطع القاطع اور موید برہان شائع ہوئیں۔ بعد میں غالب نے مزید اضافوں اور ترتیب کے ساتھ ’’قاطع برہان‘‘ کو ’’درفش کاویانی‘‘ کے نام سے شائع کیا۔ موید برہان کے جواب میں غالب نے ’’تیغ تیز‘‘ کے نام سے رسالہ تحریر کیا۔ مصنف موید برہان احمد علی احمد جہانگیر نگری نے ’’درفش کاویانی‘‘ اور ’’تیغ تیز‘‘ کا جواب ’’شمشیر تیز تر‘‘ لکھ کر دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس پورے قضیے میں غالب کے بیشتر ایرادات مبنی بر حق تھے۔ البتہ کئی جگہوں پر خود غالب کے اعتراض بھی تسامح کی وجہ سے تھے۔ اس معرکے نے غالب کی فارسی دانی اور فارسی زبان سے ان کی فطری مناسبت کو ثابت کر دیا۔ ’’شرح بدر چاچ‘‘ پر نواب کلب علی خان کی فارسی میں لکھی گئی تقریظ کی وجہ سے کچھ چپقلش غالب اور نواب کلب علی خان کے درمیان بھی ہو گئی تھی۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ غالب ہندی فرہنگ لکھنے والوں سے کلام نہیں کرتے اور اپنی تحقیق کو مانے ہوئے ہیں۔

21.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- معرکوں کی غرض و غایت اور اس کی اقسام سے واقفیت حاصل کی۔
- ادبی معرکوں کی روایت اور مقابلے، معرکے، مسابقے کے مابین افتراق کو جانا۔
- غالب کے ادبی معرکوں کے موضوعات اور صورت حال کا ادراک حاصل کیا۔
- غالب کے مختلف النوع ادبی معرکوں اور چپقلشوں سے آگہی حاصل کی۔
- مختلف النوع ادبی معرکوں کے ذریعے غالب کی فارسی دانی اور زبان دانی کی معلومات حاصل کی۔

21.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ ادبی مقابلے، ادبی مباحثے اور ادبی معرکے کے مابین فرق کی وضاحت کیجیے۔

۲۔ ادبی معرکوں کی مختلف قسموں پر مختصراً روشنی ڈالیے۔

۳۔ غالب کے ساتھ شعرائے دہلی کی چھیڑ چھاڑ کو بیان کیجیے۔

۴۔ کلکتہ کے معرکے میں غالب کے دو فارسی اشعار پر کیے اعتراضات بیان کیجیے۔

۵۔ قاطع برہان کے جواب میں لکھی گئی تحریروں کے نام مع مصنفین درج کیجیے۔

21.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ کسی خاص موقعے پر مختلف شعرا ایک دوسرے کے مقابلے میں اپنی تخلیقات پیش کریں اور حکم ان کی تخلیقات پر فیصلہ صادر کرے تو یہ صورت ادبی مقابلہ کہلاتی ہے۔ جس شاعر اور ادیب کے حق میں حکم فیصلہ کردے وہ بڑا شاعر تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ جب فریقین ایک طے شدہ موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں اور اس کے تمام ابعاد اور مختلف پہلوؤں پر بحث و مباحثے کے ذریعے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس صورت کو ادبی مباحثہ کہتے ہیں۔ کبھی فریقین ایک دوسرے سے متفق ہوجاتے ہیں اور کبھی ان کے درمیان اختلاف قائم رہتا ہے۔ اختلاف کی صورت میں مباحثہ اخبارات اور رسائل کی صورت میں جاری رہتا ہے۔ ادبی مقابلے اور ادبی مباحثے کے نتیجے میں مخصوص ادبی موضوعات و مسائل کے مختلف ابعاد سامنے آتے ہیں اور امکان کی نئی راہیں روشن ہوتی ہیں۔ یہی فوائد ادبی معرکوں سے بھی حاصل

ہوتے ہیں لیکن جب اختلاف رائے میں شدت پیدا ہوجاتی ہے تو اختلاف ذاتیات پر رکیک حملوں میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا ادبی اور لسانی مسائل پر کارآمد نکات سے واقفیت کے ساتھ ساتھ ادبی معرکے اختلاف رائے میں شدت، مخاصمت، بے اعتدالی، عیب جوئی اور طعنہ زنی کو بھی راہ دیتے ہیں۔

۲۔ ادبی معرکے چار قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے مقابلے پر سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے کلام کی تنقیص وتعریض کرنے کے ساتھ ساتھ معترضین کے اعتراضات کا جواب بھی دیتے ہیں۔ دوسری قسم یہ ہے کہ ایک فریق دوسرے پر ایراد کرتا ہے اور دوسرا فریق اس پر خاموش نظر آتا ہے۔ اس صورت میں دو باتیں امکانی ہیں۔ ایک امکان تو یہ ہے کہ دوسرا فریق پہلے فریق کے اعتراضات کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا اور خاموش رہتا ہے یا پھر وہ پہلے فریق کے ایرادات اور اعتراضات کی تاب نہ لاکر سکوت اختیار کرتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ دوسرے فریق کی جوابی کاروائی محفوظ نہ رہ سکی اور دست برد زمانہ ہوگئی۔ تیسری قسم یہ ہے کہ کسی شاعر نے معاصرین میں خود کو ممتاز اور قادر الکلام ثابت کرنے کے لیے ماقبل کے کسی مشہور اور استاد زمانہ شاعر کے کلام میں نقائص اور عیوب کی نشاندہی کی۔ استاد شاعر کی طرف سے ایرادات کا جواب دینے کے لیے اس کے تلامذہ اور مؤیدین میدان میں آگئے۔ قدیم دور میں طرحی مشاعروں کا خاصا چلن تھا۔ ان طرحی مشاعروں میں شعرا ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی سعی کرتے تھے۔ ایک دوسرے سے بڑھ کر کمال فن کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کوشش میں شعرا کے درمیان ایک قسم کی خاموش جنگ جاری رہتی تھی۔ اس صورت کو ادبی معرکے کی چوتھی قسم کہا جاتا ہے۔

۳۔ غالب کے ساتھ شعرائے دہلی کی چھیڑ چھاڑ کا پہلا واقعہ خدائے سخن میر تقی میر کا ہے۔ میر کے قیام لکھنؤ کے دوران انھیں غالب کا کلام دکھایا گیا۔ اس کلام پر میر نے یہ رائے دی کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھی راہ پر ڈال دیا تو کمال کا شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل یعنی لایعنی بکے گا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے کلام کو ابتدا میں مہمل سمجھا گیا۔ بعد کے دو واقعات شعرائے دہلی کی اسی سوچ کو ظاہر کرتے ہیں۔ دہلی کے ایک مشاعرے میں حکیم آغا جان عیش نے اپنی ایک غزل کے قطعہ بند اشعار پڑھے جس کے نشانے پر غالب کی زبان اور ان کا اسلوب بیان تھا۔ قطعہ حسب ذیل ہے:

زبان میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے
مگر اون کی زبان وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے
اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے تم کہو اور دوسرا سمجھے

ایسا ہی ایک واقعہ مولوی عبدالقادر رامپوری کا ہے جو قلعۂ معلّٰی سے بھی وابستہ رہے۔ ایک دن انھوں نے دو مصرعے فی البدیہہ موزوں کر کے مرزا غالب کو یہ کہہ کر سنایا کہ یہ شعر میں نے آپ کی غزل میں خود دیکھا ہے سنایا اور شعر کے حوالے سے مفہوم کے طالب ہوئے:

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

درج بالا شعر غالب کا نہیں۔ غالب نے اس کی تردید بھی کی۔ بالآخر غالب عبدالقادر رامپوری کا مقصود سمجھ گئے کہ وہ ان کے اشعار کو مہمل اور لایعنی نیز غالب کو مہمل گو قرار دے رہے ہیں۔

۴۔ کلکتے میں واقع مدرسۂ عالیہ کے ایک مشاعرمیں غالب نے اپنی ایک غزل پیش کی جس کا ایک شعر حسب ذیل ہے:

جزوے عالم از عالمم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موئے کہ بتاں را زمیاں برخیزد

درج بالا شعر پر یہ اعتراض کیا گیا کہ پہلے مصرعے میں ’ہمہ عالم‘ کی ترکیب غلط ہے۔ ’ہمہ‘ جمع اور ’عالم‘ واحد ہے۔ جمع اور واحد کا یہ اجتماع قتیل کے اجتہاد کی رو سے غلط ہے جائز نہیں۔ دوسرا اعتراض یہ کیا گیا کہ ’’بیشم‘‘ کی جگہ ’’بیشترم‘‘ کہنا چاہیے تھا۔ اور تیسرے اعتراض کی رو سے دوسرے مصرعے میں مستعمل ’’موئے زمیاں‘‘ کی ترکیب بھی غلط ہے۔

غالب کی ایک اور فارسی غزل کے ایک شعر پر اعتراض کیا گیا کہ اس میں ’’ردیف زدۂ بہمزہ‘‘ کا استعمال غلط ہے۔ غالب کا فارسی شعر حسب ذیل ہے:

شور اشکے بفشار بُن مژگاں دارم
طعنہ بر بے سرو سامانی طوفاں زدۂ

۵۔ قاطع برہان کے جواب میں لکھی گئی تحریروں کے نام مع مولفین حسب ذیل ہیں:

۱۔ محرق قاطع برہان از مولوی سید سعادت علی
۲۔ ساطع برہان از مرزا رحیم بیگ صاحب میرٹھی
۳۔ قاطع القاطع از امین الدین امین پٹیالہ
۴۔ موید البرہان از مولوی آغا احمد علی جہانگیر نگری

21.7 فرہنگ

(الفاظ)	(معنی)
ایراد	اعتراض، نکتہ چینی، وارد کرنا
مہمل	لایعنی، فضول، لغو، بے سروپا
ابعاد	لمبائی، چوڑائی، گہرائی، فاصلے، دوریاں
رکیک	گھٹیا، ادنی، مبتذل، تہذیب سے گرا ہوا، پتلا
مخاصمت	دشمنی، عداوت، جھگڑا
حَکَم	جج، منصف، فیصلہ کرنے والا، ثالث
قضیہ	جھگڑا، مقدمہ، آپسی نزاع
ایرانی نژاد	: ایرانی نسل کا
چشمک	چھیڑ چھاڑ، نوک جھونک، طعن و تشنیع
تقریظ	کسی دوسرے کی کتاب پر تعریفی اور تائیدی رائے دینا۔ یہ رائے کتاب کی ابتدا یا اختتام پر شامل ہوتی ہے۔

21.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ یادگار غالب : الطاف حسین حالی

۲۔ قتیل اور غالب : سید اسد علی فرید آبادی

۳۔ غالب کے ادبی معرکے ('نقوش' ادبی معرکے نمبر) : مالک رام

۴۔ اردو کے ادبی معرکے (انشا سے غالب تک) : محمد یعقوب عامر

۵۔ غالب اور کلکتہ : مرتبہ شاہد ماہلی

۶۔ اردو کے ابتدائی ادبی معرکے (ابتدا سے عہد مرزا و میر تک) : محمد یعقوب عامر

اکائی 22 غالب کے اہم معاصرین

ساخت

22.1 اغراض و مقاصد
22.2 تمہید
22.3 غالب کے معاصرین
22.3.1. شیخ محمد ابراھیم ذوق
22.3.2. مفتی صدرالدین آزردہ
22.3.3. مولانا امام بخش صہبائی
22.3.4. میرزا ہرگوپال تفتہ
22.3.5. مومن خان مومن
22.3.6. نواب مصطفیٰ خان شیفتہ
22.3.7. بہادر شاہ ظفر
22.3.8. ماحصل
22.4 اس سبق سے آپ نے کیا سیکھا؟
22.5 اپنا امتحان خود لیجئے!
22.6 فرہنگ
22.7 سوالوں کے جوابات
22.8 کتب برائے مطالعہ

22.1 اغراض و مقاصد

Ø عزیز طلبہ اس اکائی کے اغراض و مقاصد ہیں کہ

1. آپ عہدِ غالب سے واقف ہو جائیں۔
2. غالب کے اہم معاصرین کے بارے میں جان جائیں۔
3. عہدِ غالب کے اہم رجحانات کو سمجھ سکیں۔

4. ذوق، مومن، ظفر، صہبائی، آزردہ، تفتہ، شیفتہ سے متعارف ہوجائیں۔

5. عہدِ غالب میں غزل کے اسالیب سے واقف ہوں۔

22.2 تمہید

پیارے طلبا اس حصے میں ہم غالب کے معاصرین کے بارے میں گفتگو کریں گے۔ غالب کے معاصرین دو طرح کے ہیں ایک شاعر دوسرے نثر نگار۔ ہم ان دونوں کے بارے میں جان لیں گے تا کہ عہدِ غالب کا ادبی رجحان واضح ہوجائے۔ ان میں سے کئی معاصرین کے ساتھ غالب کے دوستانہ تعلقات تھے اور کئی ایک کے ساتھ ادبی رقابت تھی لیکن دونوں طرف احترام و اعتراف کا سلیقہ موجود تھا۔ آیئے ہم اصل موضوع کی طرف چل کر تفصیل سے غالب کے بارے میں جان لیتے ہیں۔

22.3 غالب کے معاصرین

غالب کے معاصرین کی فہرست بہت طویل ہے۔ یہاں پر اہم معاصرین کے اسمائے گرامی پیش کئے جاتے ہیں جن سے غالب کی گوں ناگوں ہمہ گیری کا پتہ چلتا ہے اور اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کس طرح اپنے دور سے ہم آہنگ تھے۔ ان ناموں میں منشی نبی بخش حقیر، میاداخاں سیاح، غلام بابا جان، منشی بہاری لال مشتاق، منشی شیونارائن آرام، منشی ہیراسنگھ، منشی امید سنگھ، سید محمد صالح، لالہ گوبند سنگھ، سید باقر حسین، سید فضل علی، نواب قطب الدین خاں، سید ظہیر الدین، خواجہ بدرالدین، مولوی ضیاء الدین، ظہیر الدین دہلوی، کریم الدین، نواب ضیاالدین نیر، عبداللہ علوی حسرتی، شاہ نصیرالدین نصیر، مسٹر فیلن، رام چندر، امام بخش، سبحان بخش، کریم بخش، محمد بخش، مولوی احمد علی، غلام امام شہید، غلام غوث، عبدالغفور سید اولاو علی، عبدالرزاق، مسٹر ٹیلر، سید علی، پنڈت اجودھیا پرشاد، منشی حسینی، میر سید محمد، شیخ محمد ضیاء الدین، پیر خان، پنڈت سری کرشن، مصطفیٰ خاں، سید جمیل، سید محمد صادق، سید عبدالقادر، میر حیدر علی، مولوی محمد احسن، مولوی سیف الحق، حکیم غلام رضا خاں، حکیم غلام نبی، میر فخر الدین، سردار نین سنگھ، امین الدین، قمر الدین، سید حسن، مرتضیٰ خاں، پیارے لال آشوب، امراو خان، نظیر علی، مولوی عبدالرحیم، سید نصیر علی، سید میر حسن رضوی، منشی مراری لال، مہادیو چھتہ صوفی جی، منشی مہانرائن، منشی نول کشور، بال مکند بے صبر، شیونارائن آرام، منشی جواہر سنگھ، امید سنگھ، منشی ہرگوپال تفتہ، میر مہدی مجروح، مفتی صدرالدین آزردہ، مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولانا فضل الحق خیر آبادی، خواجہ الطاف حسین حالی، سر سید احمد خاں، میر امداد علی خاں، محمد ممتاز علی خاں، مولوی غلام امام شہید، عبدالواسع، خواجہ غلام غوث، چودھری عبدالغفور سرور، حسین علی خان شاداں، غیاث الدین، عطا حسین عطا، میر نظام الدین ممنون، حکیم عبدالرحیم خاں، قاضی محمد صادق اختر، مولوی سراج الدین قتیل، بہادر شاہ ظفر، شیخ محمد ابراھیم ذوق، مومن، خان مومن، امام بخش صہبائی، رجب علی بیگ سرور شامل ہیں۔ یہ فہرست غالب کے جید معاصرین کی ہے۔ جو نہ صرف اردو نثر کے بنیاد گزاروں میں شمار ہوتے ہیں بلکہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے بانیوں میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے۔ غالب نے ایک قطعے میں اپنے معاصرین کی تعریف یوں کی ہے۔

ایک راندی سخن ازنکتہ سرایان نجم

چہ بامنت بسیار نہی از کم شان
ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود
باد در خلوت شان مشک فشان از دم شان
مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان
غالب سوختہ جان گرچہ نیرزد بشمار
ہست در بزمِ سخن ہم نفس و ہمدم شان

عزیز طلبا! جہاں تک غالب کے معاصرین کی بات ہے تو اس میں سب سے پہلے میر تقی میر کا نام لیا جاتا ہے۔ معاصر کی اصطلاح کا کلی اطلاق میر پر نہیں ہوتا لیکن اثرات کے طور پر میر کا اثر غالب کی شاعری پر واضح ہے۔" کہتے ہیں کہ میر کے بڑھاپے میں جب کم عمر غالب کے بعض اشعار ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے وہ مشہور جملہ کہا تھا کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا"۔ غالب کو کامل استاد ملا کہ نہیں ملا لیکن میر صاحب کی پیش گوئی کا پہلا حصہ صحیح ثابت ہوا کہ وہ لاجواب شاعر بن گئے۔ آئیے ہم غالب کے کچھ معاصرین کے بارے میں تفصیل سے جان لیں۔

22.3.1 شیخ محمد ابراہیم ذوق

نام محمد ابراہیم، ذات شیخ اور تخلص ذوق تھا۔ ان کا آبائی وطن قصبہ شاہ پور، تحصیل بڑھانہ، ضلع مظفر نگر تھا۔ ان کے والد شیخ محمد رمضان یہاں سے دہلی میں جا بسے تھے۔ ذوق کی ولادت 1203ھ 1788 میں ہوئی ہے اور 1231ھ کو انتقال ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم غلام رسول شوق کے مکتب میں حاصل کی، ان کے بعد مولوی میاں عبدالرزاق سے درسیات کی تکمیل کی۔ ان ہی کے مدرسے میں آزاد کے والدِ ماجد مولوی محمد باقر سے ملاقات ہوئی۔ ابتدا میں وہ شوق سے اصلاح لینے لگے اور ان کے مشورے سے ذوق تخلص اختیار کیا۔ ان کے بعد وہ شاہ نصیر سے اصلاح لینے لگے لیکن ان کی طرف شاہ نصیر کی توجہ کم رہتی تھی۔ جو غزلیں ذوق اصلاح کے لئے لاتے تھے شاہ نصیر انہیں یہ کہہ کر طبیعت پر خوب زور ڈالو اور مزید غور و فکر کرو پھر واپس کرتے تھے۔ ذوق ان سے دل برداشتہ ہوتے تھے لیکن دوست و احباب ہمت بندھاتے اور مشاعروں میں پڑھنے کا مشورہ دیتے۔ اس طرح ذوق کی مشقِ سخن جاری رہا۔ شاہ نصیر اور ذوق کے درمیان چشمک بھی خوب رہتی تھی۔ جب شاہ نصیر حیدر آباد چلے گئے تو ان کے کچھ شاگرد ذوق سے اصلاح لینے لگے جن میں نواب الٰہی بخش خاں معروف خاص کر قابلِ ذکر ہیں جن کی وجہ سے ذوق کو شہرت ملی۔ وہ بہادر شاہ ظفر کی ولی عہدی کے ساتھ ہی قلعے سے وابستہ ہوگئے تھے۔ شاہ نصیر نے میر محمد کاظم کے لئے قلعے میں جانے کا موقع فراہم کیا تھا انہوں نے یہ موقع ذوق کے لئے فراہم کیا۔ بادشاہ کی طرف سے انہیں ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ شاہ نصیر کے سلسلے سے وابستہ ہونے کی بنا پر ذوق کا رنگِ سخن دلی پر حاوی ہوگیا اور بادشاہ کا استاد ہونے کہ وجہ سے بھی کئی شعرا ان سے وابستہ ہوگئے تھے۔ ذوق کا مطالعہ واقعی وسیع تھا۔ ان کی شاعری میں فکر کی آمیزش تو ہے لیکن یہ بے ساختہ اور ثقیل ہے۔ اندازِ بیان سادہ تو ہے لیکن سپاٹ ہے جہاں لفظوں کو جوڑ کر شعر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ذوق دراصل قصائد کے شاہ سوار ہیں۔ سودا کے بعد قصیدہ

نگاری میں ان ہی کا نام لیا جاتا ہے۔ قصیدہ چونکہ مدح ستائی پر مبنی صنف ہے لہٰذا اس میں شاعر زبان دانی کی دھاک بٹھانا چاہتا ہے۔ ذوق کی شاعری میں اسی زبان دانی کی دھاک ملتی ہے جو اس دور کا ایک اہم رجحان تھا اسی وجہ سے وہ اس دور کے اہم شعرا میں تسلیم کئے جانے لگے۔ غالب، استادِ شاہ ہونے کی وجہ سے ذوق کو اپنا حریف تسلیم کرتے تھے اور ان دونوں کے درمیان ادبی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔

نمونہ کلام:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں
خوب رو کا شکایتوں سے مجھے
تو نے مارا عنایتوں سے مجھے
مرضِ عشق جسے ہو اسے کیا یاد رہے
نہ دوا یاد رہے اور نہ دعا یاد رہے
عزیز و اس کو نہ گھڑیال کی صدا سمجھو
یہ عمرِ رفتہ کی اپنی صدائے پا سمجھو
گہر کو جوہری، صراف زر کو دیکھتے ہیں
بشر کے ہیں جو مبصر بشر کو دیکھتے ہیں

22.3.2 مفتی صدرالدین آزردہ:

مفتی صدرالدین آزردہ غالب کے اہم معاصرین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ 1204ھ 1798ع کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام لطف اللہ تھا جو اصلاً کشمیری تھے۔ انہی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مفتی صاحب نے مولانا فضل امام ابن مولانا فضل حق خیر آبادی سے کتبِ معقولات اور مولانا رفیع الدین سے علومِ شرعیہ کی تعلیم حاصل کی۔ اور مولانا عبدالعزیز کی صحبت سے بھی فیض یاب ہوئے۔ مولانا محمد اسحاق سے حدیثِ مبارکہ کی سند حاصل کی۔ خطاطی اور خوش نویسی میں بہادر شاہ ظفر کے استاد رہے ہیں۔ شیفتہ ان کو افضل الفضلا اور اعلم العلما کے خطابات سے یاد کرتے تھے۔ سرسید احمد خان، نواب یوسف علی خان والئی رام پور، نواب صدیق حسن خان اور مولانا گنگوہی ان کے شاگرد رہے ہیں۔ سرسید ان کو کاشفِ دقائق، واقفِ حقائق، درویش سیرت، ملک سیرت اور مرجع جہانیان قرار دیتے ہیں۔ آزردہ کو سہلِ ممتنع کے بنیاد گزاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے غالب کو خوش گفتاری، سادگی، سلاست اور روانی کی راہ دکھلائی۔ جس زمانے میں مفتی صاحب عدالت کیا کرتے تھے کہ اس دوران غالب مقروض ہوگئے اور قرض خواہوں نے ان پر مقدمہ دائر کیا جب مفتی صاحب کی عدالت میں پیش ہوئے تو اپنا شعر:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

سنایا، یہ شعر سن کر مفتی صاحب مسکرائے اور اپنے پاس سے ان کا قرض ادا کیا۔

1857 میں انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتوے پر آپ نے دست خط کئے تھے جس کی پاداشت میں چھ مہینے کی قید و بند کی صعوبت برداشت کرنی پڑی۔ اور انگریزوں نے ملازمت سے نکال دیا جس کی وجہ سے فاقہ کشی تک کی نوبت آئی۔ مزید برآں زمین و جائداد کو بھی نیلام کر دیا، تین لاکھ لاگت تک کا کتب خانہ تلف کر دیا، اس افراتفری میں ان کا اردو و فارسی کا کلام بھی کہیں گم ہو گیا۔ وہ 16 جولائی 1868 کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ دہلی میں اہلِ کمال عام طور پر تین جگہ اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ علامہ فضل حق خیر آبادی، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اور مفتی صدرالدین آزردہ کے گھر پر۔ مفتی صاحب کا گھر ہر حال میں اہلِ علم کا مرکز تھا۔ غالب اور آزردہ میں آپسی چشمک کے باوجود دوستانہ مراسم قائم تھے۔ غالب کے کچھ فارسی خطوط آرزدہ کے نام ہیں اور اکتالیس اشعار کا ایک فارسی قصیدہ بھی انہوں نے ان کے نام لکھا ہے۔ وہ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ وہ شاہ نصیر، میاں مجرم اکبر آبادی اور ممنون کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ شگفتگی، شادابی، روانی، برجستگی، شوخی، بانکپن، نرمی، گداز، شیرنی، حلاوت، سادگی و پرکاری ان کے کلام کی بنیادی خوبیاں ہیں۔

نمونہ کلام:

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
آزردہ مر کے کوچہ جاناں میں رہ گیا
دی تھی دعا کسی نے کہ جنت میں گھر ملے
اس درد جدائی سے کہیں جان نکل جائے
آزردہ مرے حق میں ذرا یوں بھی دعا کر
کٹتی کسی طرح سے نہیں یہ شب فراق
شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں
فلک نے بھی سیکھے ہیں تیرے ہی طور
کہ اپنے کئے پر پشیماں نہیں
میں اور ذوق بادہ کشی لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں

22.3.3. مولانا امام بخش صہبائی:

امام بخش نام اور صہبائی تخلص تھا۔ ان کی ولادت 1217ھ 1802ع میں ہوئی۔ صہبائی کو معمائی بھی کہا جاتا ہے۔ ان کو فنِ معما سے بہت لگاؤ تھا اور اس فن میں کافی مہارت رکھتے تھے اسی نسبت سے ان کا نام صہبائی معمائی بھی پڑ گیا تھا۔ ان کے آباواجداد تھانیسر سے دہلی میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ ان کے والدِ مکرم اپنے دور کی نامور شخصیات میں شمار ہوتے تھے اور شہر کی معزز شخصیات سے ان کے مراسم تھے اس لئے ان کے دونوں بیٹوں کو دہلی کے بہترین اساتذہ سے تحصیلِ علم کا موقع ملا۔ خاص طور پر مولوی عبداللہ خان علوی سے انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے بعض امیر گھرانوں میں مدرسی و اتالیقی کے فرائض انجام دیے۔ محمد ذاکر حسین کے مطابق صہبائی کی علمیت اور فارسی دانی عروج پر پہنچنے کے سبب غالب ان سے خار کھاتے تھے۔ لیکن صہبائی خود کو اس سے بچاتے رہے۔ دونوں میں علمی معاملات میں نوک جھونک بھی رہتی تھی۔ وہ غالب کو ایرانیوں کے برابر سمجھتے رہے۔

چو دیدم غالب وآزردہ را از ہند صہبائی
بخاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید

شاعری کے معاملے میں غالب، صہبائی کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے تھے۔ 1857 کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں کی دارو گیر کی زد میں صہبائی کا پورا خاندان آ گیا جس میں 21 افراد شامل تھے۔ حتیٰ کہ اپنے دو بیٹوں سمیت ان کی گولیوں کا لقمہ بن گئے۔ اکبرالہ آبادی نے اس طرف اشارہ کیا ہے:

وہی صہبائی جو تھے صاحبِ قولِ فیصل
ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر

مولانا صہبائی فارسی زبان و ادب کے ایک اہم عالم تھے لہٰذا ان کی زیادہ تخلیقات اسی زبان میں ہیں۔ اس زبان میں انہوں نے گراں قدر ادبی سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ قولِ فیصل، شرح معمای ہمدانی، شرح نصیرای ہمدانی، ترجمہ حدایق البلاغت، انتخاباتِ نظم، قواعدِ اردو کے علاوہ انہوں نے کئی اہم کتابیں لکھی ہیں۔ لطافتِ بیان، ندرتِ ادا، جدتِ مضامین، اور پختگی ان کے کلام کی خوبیاں ہیں۔

22.3.4 میرزا ہرگوپال تفتہ:

میرزا ہرگوپال تفتہ کی پیدائش 1799 کو محلّہ قانون گویان، سکندرآباد ضلع بلند شہر میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام موتی لال کائستھ تھا۔ ابتدائی تعلیم والدِ محترم سے ہی حاصل کی بقیہ تعلیم دوسرے اساتذہ سے حاصل کر کے انگریزی حکومت کے محکمہ بندوبست میں قانون گو کی حیثیت سے ملازمت کی۔ بعد ازاں اس ملازمت کو ترک کر کے جے پور میں ملازم ہو گئے لیکن شاعری کے شوق میں اس کو بھی چھوڑ دیا۔ 1879 میں اس جہانِ فانی کو رخصت کیا۔ مرزا محمد حسن قتیل سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد انہوں نے غالب کی شاگردی اختیار کی۔ پہلے وہ رامی تخلص کرتے تھے، غالب نے بدل کر تفتہ رکھا اور مرزا کا خطاب عطا کیا۔ غالب ان کو بہت ہی عزیز رکھتے تھے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے 123 یعنی سب سے زیاہ خطوط تفتہ کے نام ہی بھیجے ہیں۔ اور ان کی مدت تقریباً بیس سال پر محیط ہے۔ ان میں زیادہ تر خطوط شعری اصلاحات سے متعلق ہیں۔ ان میں تنبیہ، مشورہ، پیار اور محبت غرض ہر طرح کی اصلاحات شامل ہیں۔ ایک خط میں لکھا ہے کہ 'خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں پس تمہارے نتائجِ طبع میرے معنوی پوتے ہوئے'۔ غالب

نے ان کو اپنے خطوط میں بہت سے مشفقانہ القاب سے بھی نواز ہے۔ تفتہ کی شاعری کا معتد دحصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ یہ زیادہ تر تقلیدی غزلیں ہیں جن میں جدت وندرت کی کمی جھلکتی ہے۔ ان پر سب سے زیادہ اثر مرزا جلال اسیر کا ہے۔ انہوں نے سعدی کی بوستان کی پیروی میں اخلاقیات پر مبنی مثنوی سنبلستان لکھی ہے۔ اس کا نام بھی غالب کے مشورے پر رکھا۔ اس میں تیرہ ابواب ہیں۔ ان کی ایک اور کتاب تضمینِ گلستان ہے جسے انہوں نے اپنے چھوڑے لڑکے پتمبر سنگھ کی یاد میں لکھا ہے جو ان کی زندگی میں ہی وفات پا گیا تھا۔ اس میں انہوں نے گلستانِ سعدی کے آٹھ ابواب کی تضمین کی ہے۔ انہوں نے اپنی اکثر تصنیفات میں فارسی کو وسیلہ اظہار بنایا ہے۔

نمومہ کلام:

22.3.5 مومن خان مومن:

ذوق کے بعد غالب کے معاصرین میں مومن خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ نام حکیم مومن خان اور تخلص مومن تھا۔ 1800ء میں دہلی میں پیدا ہوئے انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم شاہ عبدالقادر صاحب کے مدرسے میں پائی۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے درس میں بھی شرکت کرتے تھے۔ اور فارسی زبان کی تعلیم عبداللہ خان علوی سے حاصل کی۔ اپنے خاندانی پیشے طب کی تعلیم اپنے والدِ ماجد غلام نبی خان اور چچا غلام حیدر خان سے لی۔ مومن نجوم، عملیات، رمل، جعفر، موسیقی، شطرنج، اور ریاضی میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ بہت ساوقت عشق عاشقی اور عیش پرستی میں گزارا، لیکن 1803ء میں سید احمد شہید کی بالاکوٹ میں شہادت کے واقعے نے ان کی زندگی کو بدل دیا اور موسیقیت سے توبہ کر کے صوم وصلاۃ کے پابند ہوگئے۔ اور 1851ء کو وہیں وفات پائی۔

کلب علی فائق کے بقول نو برس کی عمر میں انہوں نے شاعری شروع کی تھی۔ ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لیکن جب ناسخ کا کلام دلی پہنچا تو اس کی طرف مائل اور بعد میں میر کی طرف مائل ہوئے۔ مومن بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں کیونکہ اس دور میں غزل ہی محبوب و مرغوب صنف تھی۔ لیکن بقیہ شعرا کی طرح انہوں نے قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رباعی اور واسوخت میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزل میں تغزل، داخلیت، نازک خیالی، ندرتِ اسلوب، مکر شاعرانہ جیسے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ ان کی غزل کے مضامین حسن وعشق کے معاملات کے گرد گھومتے ہیں۔ انہوں نے اس میں نسوانی پیکر کو پیش کیا جس کا ذکر ان کی غزل میں 'پردہ نشین' کے عنوان سے ملتا ہے۔ معاملہ بندی بھی مومن کی غزل کی بڑی خصوصیات میں شمار کی جاتی ہے۔ حسینوں سے چھیڑ چھاڑ، رقیب سے اپنے رویے کا اظہار، وصل وہجر کی داستان معاملہ بندی میں بیان کیے جاتے ہیں۔ شاعری بیان کی شوخی اور عشق کے جذبے سے مغلوب ہوکر اگر ناگفتنی کو گفتنی بنادے تو معاملہ بندی نازک مرحلہ بن جاتا ہے۔ ایسے ہی نازک خیالی مومن کی غزل کی اہم خصوصیت ہے۔ انہوں نے اس نازک خیالی میں ندرتِ اسلوب اور شاعرانہ شوخی کو استعمال کیا ہے۔ مکرِ شاعرانہ کے لئے بھی مومن جانے جاتے ہیں۔ اس صنعت کو انہوں نے خوبی سے بھرتا ہے۔ انہوں نے تشبیہات واستعارات اور صنائع وبدائع کو بھی خوبی سے نبھایا ہے۔

مومن نے چھ مثنویاں 'شکایتِ ستم، قصہ غم، قولِ غمیں، تفِ آتشیں، حنینِ مغموم، آہ زار، مظلوماں' لکھیں ہیں۔ ان تمام مثنویوں کے موضوعات عاشقانہ ہیں۔ ان کے قصائد کی تعداد نو ہے جو زیادہ تر مذہبی شخصیات پر مبنی ہیں۔ فکر کی سطح پر دیکھیں تو غالب ہمہ گیر نظر آتے ہیں اور

مومن کی فکر کا دائرہ ومحور محدود ہے۔ غالب حیات وکائنات کے وسائل پر ایک حکیم، فلسفی اور دانشور کی طرح غور کرتے ہیں اور اس غور وفکر کو اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں اور مومن ایک عام راہ گیر کی طرح گزر جاتا ہے جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے اس کو بیان کرتا ہے۔ اس میں وہ مشکل الفاظ واصطلاحات کو استعمال کرتا ہے لیکن مشکل الفاظ کسی کلام میں گہرائی پیدا نہیں کر سکتے۔ اسلم پرویز نے یہ بات صحیح لکھی ہے کہ 'مومن کی شاعری کا صرف ایک پہلو ایسا ہے جہاں وہ شعرائے متقدمین اور ہم عصر شعراء سے ممتاز نظر آتے ہیں اور وہ ہے ان کی عشقیہ شاعری'۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس شعر کے بارے میں مشہور ہے کہ غالب نے کہا تھا کہ اگر مومن مجھے یہ شعر دیں تو میں اپنا پورا دیوان دوں گا۔ نمونہ کلام:

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی
کیا جانے کیا لکھا تھا اسے اضطراب میں
قاصد کی لاش آئی ہے خط کے جواب میں
نہ کرو اب نباہ کی باتیں
تم کو اے مہربان دیکھ لیا
ہو گیا راز عشق بے پردہ
اس نے پردہ سے جو نکالا منہ
ہو گئے نام بتاں سنتے ہی مومن بے قرار
ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں
میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

22.3.6 نواب مصطفیٰ خان شیفتہ:

نام نواب محمد مصطفیٰ خان اور تخلص شیفتہ تھا۔ ان کی پیدائش 1806ء کو دہلی میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام نواب مرتضیٰ خاں تھا جن کو بہادر مظفر جنگ کا خطاب ملا تھا۔ انہوں نے رواجِ زمانہ کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر لی۔ میاں جی مالا مال سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا حاجی محمد نور دہلوی نقشبندی سے فنِ حدیث وتجوید میں استفادہ کیا۔ حج کے دوران شیخ عبداللہ سراج حنفی سے مکہ معظّمہ میں صحاح کے ابتدائی حصے تبرکاً پڑھے اور شیخ محمد عابد سندھی سے بھی استفادہ کیا اور روایت کرنے کی اجازت ملی۔ ان کے علاوہ شاہ غلام علی دہلوی کے خلیفہ مولوی کرم اللہ سے کچھ علوم پڑھے۔ وہ فرائض کے علاوہ نوافل کی پابندی بھی کرتے تھے اور تہجد کا خاص طور پر اہتمام کرتے تھے۔ ان کا شمار دہلی کے رؤسا اور جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے تعلقہ داروں میں ہوتا تھا۔ لیکن 1857 کی جنگِ آزادی کے دوران ٹھاکروں نے ان کے قلعہ

جہانگیر آباد پر قبضہ کیا اور ان کے محلوں کو آگ لگائی۔ گھر کا ساز و سامان جلنے کے ساتھ ساتھ ان کا کتب خانہ بھی جل گیا جس میں ان کی اپنی تصانیف اور اردو فارسی کلام بھی آگ کی نذر ہو گیا۔

شیفتہ نے مومن خان مومن سے شاعری کی اصلاح لی۔ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص اختیار کرتے تھے۔ انہوں نے سولہ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ اور اکیس سال کی عمر میں دیوان مرتب کر کے مطبع آئینہ سکندری سے چھاپا تھا۔

اے شیفتہ اس فن میں ہوں اک پیرِ طریقت
گو عمر ہے میری ابھی اکیس برس کی

ان کا فارسی کلام حمد، تصوف، حکمت، اخلاق اور محبت کے مضامین سے بھرا ہوا ہے۔ ان کے اردو کلام میں گرمی اور لذت کے علاوہ شکوہِ الفاظ اور چستء ترکیب بھی پائی جاتی ہے۔ وہ قدما کے سیدھے سادے خیالات اور معمولی اسالیب کو لفظی اور معنوی تصرف کے ساتھ ایک نئے سانچے میں ڈالتے تھے۔ ان کے کلام میں سنجیدگی اور متانت کا خاص لحاظ پایا جاتا ہے۔

نمونہ کلام:

اظہار عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ
یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا
فسانے یوں تو محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیب داستاں کے لیے
ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بد نام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا
شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی
بے عذر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر
یہ اہل مروت ہیں تقاضا نہ کریں گے
کس لیے لطف کی باتیں ہیں پھر
کیا کوئی اور ستم یاد آیا

22.3.7. بہادر شاہ ظفر:

بہادر شاہ ظفر کا پورا نام سراج الدین محمد بہادر شاہ تھا۔ تاریخی نام ابو ظفر تھا۔ اسی رعایت سے انہوں نے اپنا تخلص ظفر اختیار کیا۔ اورنگ زیب کے ایک فرزند شاہ عالم کا لقب بھی بہادر شاہ تھا لہٰذا یہ بہادر شاہ ظفر ثانی کہلائے جاتے ہیں۔ ان کے والد کا نام اکبر شاہ ثانی تھا جن کی ایک ہندو بیوی لال بائی تھی انہی کے بطن سے ان کی ولادت 18 شعبان، 1189ھ بمطابق 14 اکتوبر 1775ء کو ہوئی۔ 1837ع

میں ان کے والد کے انتقال کے ساتھ ہی وہ تخت نشین ہوئے۔ اکبر شاہ ثانی کو انگریز سرکار کی طرف سے ماہانہ ایک لاکھ روپیہ وظیفہ ملتا تھا اور ان کا اپنا اندوختہ بھی تھا لہٰذا بہادر شاہ ظفر کا کچھ زمانہ آرام سے گزرا۔ لیکن اخیر عمر میں جب یہ اندوختہ ختم ہوا تو اخراجات کی بھرپائی کے لئے پنشن کم پڑ گئی، جس کے لئے انہوں نے انگریزوں سے اضافے کا مطالبہ کیا لیکن انہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ لہٰذا آخری ایام میں لال قلعے میں عسرت اور تنگدستی کا زمانہ تھا۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ معاملاتِ سلطنت روز بروز ان کے ہاتھ سے نکل جاتے تھے اور دربار کا نظام درہم برہم ہوتا جاتا تھا۔ ظفر کی مشکلات میں اضافے کا باعث 1857 کی جنگِ آزادی بنی۔ ان کے تینوں بیٹوں مرزا اسماعیل، ابوبکر اور خضر سلطان کے کٹے ہوئے سر ان کے سامنے طشتری میں پیش کئے گئے۔ ان کو لال قلعہ چھوڑنا بڑا اور ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار ہو کر آخر کار رنگون میں خاک کا پیوند بنا پڑا۔ رنگون میں وہ اکثر بیمار رہا کرتے تھے۔ آخر کار جمعہ 7 نومبر 1862ء کو انہوں نے اپنی جان خالقِ حقیقی کو سپرد کی۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر، دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

ان کا کلام وارداتِ قلبی کا آئینہ دار ہے۔ ایک عظیم تہذیب کے خاتمے کا واقعہ ان کی ذات سے منسلک ہے۔ ان کی شعری تخلیقات ایک ضخیم کلیات پر پھیلی ہوئی ہیں جس میں بیس ہزار کے قریب اشعار موجود ہیں۔ انہوں نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے جن میں مخمس، مسدس، قصائد، سہرا، دوہے، ٹھمری، گیت، قطعات شامل ہیں لیکن غزل ہی ان کی مرغوب صنف تھی۔ ان کی غزل میں وہ تمام خصوصیات اور موضوعات مل جاتے ہیں جو اس دور کا تقاضا تھے۔ لیکن زیادہ تر اس میں ان کی ذاتی المناکی اور محرومیوں کا بیان ہے۔ ان کی ذات صرف اپنی ذات نہ تھی بلکہ ایک شہنشاہ کی حیثیت سے ہندوستانیوں کا کلی وجود تھا جو اب انگریزوں کے دستِ نگر تھا لہٰذا ان کی اس ذات کی بے بسی سب کی بے بسی تھی جو انہوں نے دلگداز انداز میں اپنی شاعری میں بیان کی ہے۔ افسردگی، مایوسی، حزن کی لے ان کے کلام کی اوپری سطح سے ہی واضح طور پر جھلکتی ہے۔

نمونہ کلام:

تم نے کیا نہ یاد کبھی بھول کر ہمیں
ہم نے تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا دیا
کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل کوئی کیا کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے
ان حسرتوں سے کہہ دو کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں
اے وائے انقلاب زمانے کے جور سے
دلی ظفر کے ہاتھ سے پل میں نکل گئی

لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالم ناپائیدار میں
یہ قصہ وہ نہیں تم جس کو قصہ خواں سے سنو
مرے فسانۂ غم کو مری زباں سے سنو

22.3.8 ماحصل

عزیز طلبا! اس اکائی میں ہم نے غالب کے معاصرین کے بارے میں واقفیت حاصل کی۔ کچھ معاصرین کے صرف ناموں پر اکتفا کیا گیا اور چند اہم کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی گئی۔ جن میں ذوق، مومن، ظفر، شیفتہ، تفتہ، صہبائی، آزردہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے مطالعے سے ہمیں عہدِ غالب کو سمجھنے کا موقع ملا۔ جہاں تک ذوق کی بات ہے تو وہ غالب کے اہم معاصر تسلیم کئے جاتے ہیں ان دونوں کے درمیان ادبی چشمک رہتی تھی۔ ذوق غزل میں زیادہ کمال حاصل نہ کر پائے لیکن قصیدہ میں سودا کے بعد انہی کا نام لیا جاتا ہے۔ آزردہ کو سہلِ ممتنع کے بنیاد گزاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے غالب کو خوش گفتاری، سادگی، سلاست اور روانی کی راہ دکھلائی۔ غالب اور آزردہ میں آپسی چشمک کے باوجود دوستانہ مراسم قائم تھے۔ غالب کے کچھ فارسی خطوط آرزدہ کے نام ہیں اور اکتالیس اشعار کا ایک فارسی قصیدہ بھی انہوں نے ان کے نام لکھا ہے۔ غالب کے معاصرین میں صہبائی کا نام بھی اہم ہے۔ محمد ذاکر حسین کے مطابق صہبائی کی علمیت اور فارسی دانی عروج پر پہنچنے کے سبب غالب ان سے خار کھاتے تھے۔ لیکن صہبائی خود کو اس سے بچاتے رہے۔ دونوں میں علمی معاملات میں نوک جھونک بھی رہتی تھی۔ صہبائی، غالب کو ایرانیوں کے برابر سمجھتے رہے۔ اور شاعری کے معاملے میں غالب، صہبائی کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے تھے۔ مرزا ہر گوپال تفتہ کو غالب بہت ہی عزیز رکھتے تھے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے 123 یعنی سب سے زیاہ خطوط تفتہ کے نام ہی بھیجے ہیں۔ اور ان کی مدت تقریباً بیس سال پر محیط ہے۔ ان میں زیادہ تر خطوط شعری اصلاحات سے متعلق ہیں۔ ان میں تنبیہ، مشورہ، پیار و محبت غرض ہر طرح کی اصلاحات شامل ہیں۔ ایک خط میں لکھا ہے کہ 'خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں پس تمہارے نتائجِ طبع میرے معنوی پوتے ہوئے'۔ غالب نے ان کو اپنے خطوط میں بہت سے مشفقانہ القاب سے بھی نوازا ہے۔ مومن بھی غالب کے معاصرین میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مومن کی غزل میں تغزل، داخلیت، نازک خیالی، ندرتِ اسلوب، مکر شاعرانہ جیسے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ ان کی غزل کے مضامین حسن و عشق کے معاملات کے گرد گھومتے ہیں۔ معاملہ بندی بھی مومن کی غزل کی بڑی خصوصیات میں شمار کی جاتی ہے۔ فکر کی سطح پر دیکھیں تو غالب ہمہ گیر نظر آتے ہیں اور مومن کی فکر کا دائرہ و محور محدود ہے۔ غالب حیات و کائنات کے وسائل پر ایک حکیم، فلسفی اور دانشور کی طرح غور کرتے ہیں اور اس غور و فکر کو اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں اور مومن ایک عام راہ گیر کی طرح گزر جاتا ہے جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے اس کو بیان کرتا ہے۔ اس میں وہ مشکل الفاظ و اصطلاحات کو استعمال کرتا ہے لیکن مشکل الفاظ کسی کلام میں گہرائی پیدا نہیں کر سکتے۔ شیفتہ نے مومن خان مومن سے شاعری کی اصلاح لی۔ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص اختیار کرتے تھے۔ انہوں نے سولہ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ اور اکیس سال کی عمر میں دیوان مرتب کر کے مطبع آئینہ سکندری سے چھاپا تھا۔ ان کا فارسی کلام حمد،

تصوف، حکمت، اخلاق اور محبت کے مضامین سے بھرا ہوا ہے۔ ان کے اردو کلام میں گرمی اور لذت کے علاوہ شکوہِ الفاظ اور چستئی ترکیب بھی پائی جاتی ہے۔ وہ قدما کے سیدھے سادے خیالات اور معمولی اسالیب کو لفظی اور معنوی تصرف کے ساتھ ایک نئے سانچے میں ڈالتے تھے۔ ان کے کلام میں سنجیدگی اور متانت کا خاص لحاظ پایا جاتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر بھی غالب کے ایک اہم معاصر ہیں۔ ان کا کلام وارداتِ قلبی کا آئینہ دار ہے۔ ایک عظیم تہذیب کے خاتمے کا واقعہ ان کی ذات سے منسلک ہے۔ ان کی غزل میں وہ تمام خصوصیات اور موضوعات مل جاتے ہیں جو اس دور کا تقاضا تھے۔ لیکن زیادہ تر اس میں ان کی ذاتی المناکی اور محرومیوں کا بیان ہے۔ ان کی ذات صرف اپنی ذات نہ تھی بلکہ ایک شہنشاہ کی حیثیت سے ہندوستانیوں کا کلی وجود تھا جو اب انگریزوں کے دستِ نگر تھا لہٰذا ان کی اس ذات کی بے بسی سب کی بے بسی تھی جو انہوں نے دلگداز انداز میں اپنی شاعری میں بیان کی ہے۔

22.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے

☆ غالب کے معاصرین کے بارے میں واقفیت حاصل کی۔

☆ غالب کے زمانے کے شعری موضوعات سے آگاہی حاصل کی۔

☆ غالب کے اپنے معاصرین کے ساتھ کس طرح کے تعلقات تھے، یہ معلوم ہوا۔

☆ شاعرانہ چشمکوں کے بارے میں جانکاری حاصل کی۔

☆ جنگِ آزادی میں غالب کے معاصرین کا کیا کردار رہا ہے اس سے روشناس ہوئے۔

22.5 اپنا امتحان خود لیجیے:

سوال 1۔ غالب کے پانچ معاصرین کا نام لکھیے؟

سوال 2۔ ذوق کی شاعری کی کچھ اہم خوبیاں بیان کیجئے؟

سوال 3۔ ظفر نے کس طرح کی شاعری لکھی ہے؟

سوال 4۔ مومن خان مومن شاعری میں کن صنعتوں کے استعمال کے لئے یاد کئے جاتے ہیں؟

سوال 5۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے حالاتِ زندگی مختصراً بیان کیجئے؟

22.6 فرہنگ

اسالیب: اسلوب کی جمع، لکھنے کا ایک خاص انداز یا طرز

رقیب: دشمن، شاعری کی ایک اہم اصطلاح جو اکثر استعارے یا علامت کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔

مہمل: وہ بات یا کلام جس کا کوئی معنی نہ ہو لیکن کسی لفظ سے منسلک کر کے اس کو بولا جاتا ہو۔ جیسے چائے، وائے، دوا، ووا وغیرہ۔

سپاٹ: کسی چیز یا بات کا عامی یا سیدھا ہونا۔

ثقیل: بھاری، بوجھل

مدح ستائی: تعریف

دھاک بٹھانا: کسی پر اپنا تاثر یا رعب چھوڑنا۔

المناکی: دردناکی، خاص طور پر انجام کے لحاظ سے آنے والے مصائب و مشکلات۔

دستِ نگر: بے بسی، کسی کے سامنے محتاج ہو کر ہاتھ پھیلانا۔

22.7 سوالوں کے جوابات

1: شیخ محمد ابراہیم ذوق، مومن خان مومن، بہادر شاہ ظفر، مرزا ہر گوپال تفتہ، مصطفیٰ خان شیفتہ۔

2: ذوق کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ ان کی شاعری میں فکر کی آمیزش تو ہے لیکن یہ بے ساختہ اور ثقیل ہے۔ اندازِ بیان سادہ تو ہے لیکن سپاٹ ہے جہاں لفظوں کو جوڑ کر شعر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ذوق دراصل قصائد کے شاہ سوار ہیں۔ سودا کے بعد قصیدہ نگاری میں ان ہی کا نام لیا جاتا ہے۔ قصیدہ چونکہ مدح ستائی پر مبنی طویل صنف ہے لہٰذا اس میں شاعر زبان دانی کی دھاک بٹھانا چاہتا ہے۔ ذوق کی شاعری میں اسی زبان دانی کی دھاک ملتی ہے جو اس دور کا ایک اہم رجحان تھا اسی وجہ سے وہ اس دور کے اہم شعرا میں تسلیم کئے جانے لگے۔

3: ظفر کا کلام وارداتِ قلبی کا آئینہ دار ہے۔ ایک عظیم تہذیب کے خاتمے کا واقعہ ان کی ذات سے منسلک ہے۔ ان کی شعری تخلیقات ایک ضخیم کلیات پر پھیلی ہوئی ہیں جس میں بیس ہزار کے قریب اشعار موجود ہیں۔ انہوں نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے جن میں مخمس، مسدس، قصائد، سہرا، دوہے، ٹھمری، گیت، قطعات شامل ہیں لیکن غزل ہی ان کی مرغوب صنف تھی۔ ان کی غزل میں وہ تمام خصوصیات اور موضوعات مل جاتے ہیں جو اس دور کا تقاضا تھے۔ لیکن زیادہ تر اس میں ان کی ذاتی المناکی اور محرومیوں کا بیان ہے۔ ان کی ذات صرف اپنی ذات نہ تھی بلکہ ایک شہنشاہ کی حیثیت سے ہندوستانیوں کا کلی وجود تھا جو اب انگریزوں کے دستِ نگر تھا لہٰذا ان کی اس ذات کی بے بسی سب کی بے بسی تھی جو انہوں نے دلگداز انداز میں اپنی شاعری میں بیان کی ہے۔ افسردگی، مایوسی، حزن کی لے ان کے کلام کی اوپری سطح سے ہی واضح طور پر جھلکتی ہے۔

4: مومن کی شاعری کے مضامین حسن و عشق کے معاملات کے گرد گھومتے ہیں۔ انہوں نے اس میں نسوانی پیکر کو پیش کیا جس کا ذکر ان کی غزل میں 'پردہ نشین' کے عنوان سے ملتا ہے۔ معاملہ بندی بھی مومن کی غزل کی بڑی خصوصیات میں شمار کی جاتی ہے۔ حسینوں سے چھیڑ چھاڑ، رقیب سے اپنے رویے کا اظہار، وصل و ہجر کی داستان معاملہ بندی میں بیان کیے جاتے ہیں۔ شاعری بیان کی شوخی اور عشق کے جذبے سے مغلوب ہو کر اگر ناگفتنی بنا دے تو معاملہ بندی نازک مرحلہ بن جاتا ہے۔ ایسے ہی نازک خیالی مومن کی غزل کی اہم خصوصیت ہے۔ انہوں نے اس نازک خیالی میں ندرتِ اسلوب اور شاعرانہ شوخی کو استعمال کیا ہے۔ مکرِ شاعرانہ کے لئے بھی مومن جانے جاتے ہیں۔ اس صنعت کو انہوں نے خوبی سے برتا ہے۔ انہوں نے تشبیہات و استعارات اور صنائع و بدائع کو بھی خوبی سے نبھایا ہے۔

5: نام نواب محمد مصطفیٰ خان اور تخلص شیفتہ تھا۔ ان کی پیدائش 1806ء کو دہلی میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام نواب مرتضیٰ خاں تھا جن کو بہادر مظفر جنگ کا خطاب ملا تھا۔ انہوں نے رواجِ زمانہ کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر لی۔ میاں جی مالا مال سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا حاجی محمد نور دہلوی نقشبندی سے فنِ حدیث و تجوید میں استفادہ کیا۔ حج کے دوران شیخ عبداللہ سراج حنفی سے مکہ معظّمہ میں صحاح کے ابتدائی حصے تبرکاً پڑھے اور شیخ محمد عابد سندھی سے بھی استفادہ کیا اور روایت کرنے کی اجازت ملی۔ ان کے علاوہ شاہ غلام علی دہلوی کے خلیفہ مولوی کرم اللہ سے کچھ علوم پڑھے۔ وہ فرائض کے علاوہ نوافل کی پابندی بھی کرتے تھے اور تہجد کا خاص طور پر اہتمام کرتے تھے۔ ان کا شمار دہلی کے رئیسوں اور جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے تعلقہ داروں میں ہوتا تھا۔

22.7 کتب برائے مطالعہ

11: اصلاحی، عبدالرحمٰن پرواز۔ مفتی صدرالدین آزردہ۔ دہلی مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، 1977۔
2. اعظمی، شعیب۔ ''غالب اور تفتہ۔'' میرزا ہرگوپال تفتہ۔ مدیر ریحانہ خاتون۔ دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، 2008۔ 95-82۔
3. پرویز، اسلم۔ بہادر شاہ ظفر۔ دہلی، انجمنِ ترقی اردو (ہند)، 2013۔
4. حسین، محمد ذاکر۔ امام بخش صہبائی کی ادبی خدمات۔
5. رضا، کالی داس گپتا۔ خاقانی ہند ذوق دہلوی، معتبر کوائف اور مستند کلام۔ دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند)، 2001۔
6. صدیقی، ظہیر احمد۔ مومن خان مومن۔ دہلی، ساہتیہ اکادمی، 1958۔